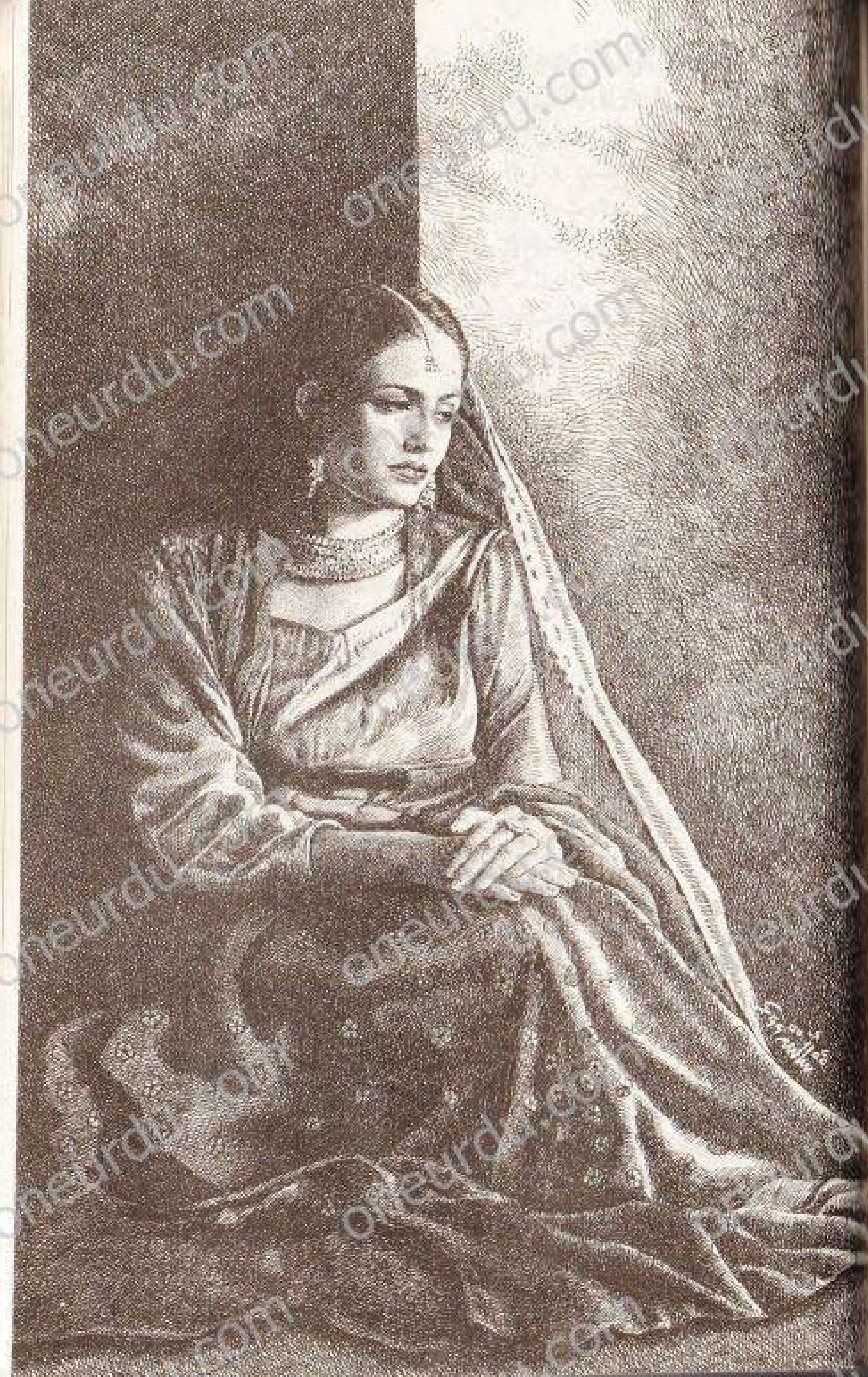




آسیہ رزاقی

میں جاگوں تیرے ساتھ

مکمل ناول

اکیلے پن کا زہر دماغ کو ماؤف کرنے کے لیے کافی تھا۔ عجیب سی بے کسی تھی۔ ذہن سویا ہوا تھا۔ دل اچاٹ اور بیزار۔ کھانے کو دل چاہتا نہ لیٹنے پر نیند آتی۔ ہر سکھ' ہر آرام دور تھا۔ بستر کانٹے اور در و دیوار میں نوکیں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پلنگ' کرسی' حتیٰ کہ فرش بھی آگ کے شعلوں جیسی تپش سے جھلس رہے تھے۔ کوئی جگہ نہ تھی۔ راستہ نہ تھا۔ اِدھر سے اُدھر گھومتے پھرتے اس کے پیر شل ہو گئے تھے۔ ٹانگیں تھک کر سوج گئی تھیں۔ لیکن وقت گزر رہا تھا اور وہ نہیں بیٹھ پائی نہ لیٹنے پر آمادہ ہوتی۔ سب اسے سمجھا کر تھک گئے تھے۔ مگر اس کے اوپر سے ہر نصیحت' ہر صدا یوں گزر جاتی جیسے ہوا کا جھونکا۔

اپنی قسم کا ایک۔ گھر میں دل کب لگتا ہے اس کا جوگی ہے وہ تو۔ جنگلوں جنگلوں مارا مارا پھرتا ہے۔ گھر کے کسی فرد سے اسے محبت نہیں۔ سوائے اپنے بھائی کے بس موڈی ہے۔ اگر واصف سے خفا ہو کر نہ جاتا تو مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیتا۔ ہمیں عادت ہے اس کی ہر حرکت کا علم ہے۔ خود کو اکیلا بنا لیا ہے اس دنیا میں۔ کہتا ہے میرا کوئی نہیں۔ ارے کسی کو اپنا بناؤ گے تو کوئی بنے گا نا۔ یا تم غیریت برتو اور سب تمہارے آگے پلکیں بچھائیں۔ ایسا نہیں ہوتا تم سے ہمارا خاص رشتہ نہیں ہے مگر سب نے تمہیں اپنا سمجھا ہے۔ تمہاری اپنی ذات ہی اس کا سبب بنی ہے تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ چلو اس کا غم نہ کرو۔" مگر وہ بجھے بجھے دل کے ساتھ غزالہ کی شادی میں شریک رہی۔ جب انکل نے کہا۔

"اس گھر کی پہلی شادی ہے اور میں یہ فرض احمر کے بغیر ادا کروں عجیب لگ رہا ہے۔ پتا نہیں میرا بھائی کہاں ہو گا۔" ان کے لہجے میں کتنی اداسی اور دکھ کا تاثر تھا۔

صامیہ کے سینے میں آنسو مچلنے لگے۔ وہ کمرے میں جا کر چھپ کر رونے لگی۔

"ہائے میرے محسن کو میرے کارن یہ دکھ سہنا پڑا ہے' کیسی احسان فراموش ہوں میں۔" اس نے انکل کو ایک جگہ اکیلے کھڑا پایا تو دوڑ کر ان کے پاس گئی۔ وہ ایک کونے میں کھڑے چائے پی رہے تھے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔

"انکل! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" اس نے مجرمانہ طرز سے گردن جھکائی۔

"ہاں ہاں' کہو بیٹے! کوئی خاص بات ہے کیا؟ یا پھر ایسا کرتے ہیں کہ رات کو تمام لوگوں کے جانے کے بعد بات کر لیں۔ ذرا سکون سے اس وقت مجھے بھی بہت سے کام ہیں اور تم بھی باقی لڑکیوں کے ساتھ انجوائے کرو۔" انہوں نے خالی چائے کی پیالی کسی بچے کو تھما دی۔

"انکل! دراصل بات بہت بڑی تو نہیں ہے۔" اس نے کہا اور چپکے چپکے اپنی غلطی کا اعتراف کر ڈالا کہ اس کی بے ہودہ حرکت' بے صبری اور جلد بازی کی وجہ سے امیر احمر اعظم کو اتنا دکھ پہنچا کہ وہ گھر سے چلے گئے۔

"واصف بہت غصے میں ان کے پاس گئے تھے۔ پتا نہیں کیا کیا کہا ہو گا؟ ان کا قصور بھی نہیں۔ وہ مجھے بری طرح روتے دیکھ کر ہی مشتعل ہو گئے تھے۔" اس نے تفصیل سے سنا دیا۔ انکل اپنی بے حد مصروفیت کے باوجود صبر سے اس کی کہانی سنتے رہے۔ بے چارے انکل دو بیٹوں سے انہیں اس وقت کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔ وہ دونوں تو گانے بجانے والی ٹولی میں لڑکیوں کے ساتھ اپنے فن کے مظاہرے کر رہے تھے۔

"تم پریشان نہ ہو بیٹی! اس لڑکے کی افتاد ہی یہ ہے کہ صبر و برداشت اس میں نہیں ہے۔" انکل نے پیار سے اس کے سر کو سہلایا۔ "دراصل وہ بچپن سے ہی محرومیوں کا شکار رہا۔ غضب یہ ہوا کہ میں نے بھی بہت جلدی شادی کر ڈالی اور بیوی بچوں میں مشغول ہو گیا۔ اس پر میری بے اعتنائی نے بہت اثر کیا۔ اور وہ سب سے بیزار ہو گیا۔ ورنہ یقین کرو وہ پہلے ایسا نہ تھا۔ صابر بھی تھا اور خوش مزاج بھی۔ پڑھنے میں بہت تیز تھا مگر اسے یہ احساس ہو گیا کہ اس کی کسی کو فکر نہیں ہے۔ اس کا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔ ایک مجھ سے لگاؤ تھا اسے تو میں نے بھی اس کو نظر انداز کر دیا۔ اگر میں اپنی شادی کے سلسلے میں اس سے مشورہ لے لیتا یا اسے بھی اس راز میں شریک کر لیتا۔ تو وہ یقیناً" بڑھ چڑھ کر شادی میں حصہ لیتا مگر میں نے بھی اس کو بتائے بغیر شادی طے کر لی۔ وہ مایوس ہو گیا اور مجھ سے ناراض بھی۔"

"مگر وہ سب گھر والوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ ان کا یعنی لالہ رخ وغیرہ کا کیا قصور ہے؟" وہ بے قراری سے پوچھ بیٹھی۔

"قصور.... نہیں نفرت تو نہیں کرتا مگر بیزاری کا اظہار کرتا رہتا ہے اور یہ سب وہ مجھے دکھانے کے لیے کرتا ہے۔ میں اسے خوب جانتا ہوں بیٹی! وہ بہت حساس' نرم دل اور زخمی جذبات کا مالک ہے۔ مجھے بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ خیر جہاں رہے خوش

رہے۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے اب مزید دکھ نہ دوں مگر وہ اتنا فریب کھا چکا ہے کہ ذرا سی بات بھی اسے تیر کی مانند لگتی ہے۔ پھر اس دکھ یا زخم کو سہنے کے لیے کہیں چلا جاتا ہے۔ آجائے گا جب شادی ختم ہو گی تو آئے گا۔ میرے پھیلے ہوئے کاموں کو سمیٹنے کے لیے۔ یقین کرو میں تھک گیا ہوتا اگر یہ امید نہ ہوتی۔"

صامیہ تعجب سے انہیں دیکھتی رہی۔ انہیں اپنے اس نکمے بھائی سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ بلکہ بہت امیدیں تھیں۔ ادھر گھر والے باقی سب لوگ تو اس شخص کو نکما' نکھٹو' بدنفس جانے کیا کیا سمجھتے تھے۔ وہ بات ختم کر کے چلے گئے۔ ان کے قدم تھکے تھکے اٹھ رہے تھے۔ شادی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ لڑکیوں کی ٹولیاں گانے میں معرکے سر کر رہی تھیں۔ واصف اور عارف پیش پیش تھے دولہا کی طرف کی لڑکیاں بھی کم نہ تھیں۔ ان کی مدد کے لیے بھی لڑکے آگئے اور پرزور تالیوں اور بے ہنگم شور سے محفل گونجنے لگی اس کے سر میں دھمک ہو رہی تھی۔ وہ غزالہ آپی کے کمرے کی طرف چل دی۔ وہ اپنی ایک دو سہیلیوں کے ساتھ تھیں۔ مجمع بہت تھا۔ راستہ بناتی ہوئی وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ تبھی اس نے ایک آواز سنی۔

"ہیلو صامیہ! کہاں جا رہی ہو؟"

اس کی پھپھو کے بیٹے اطہر علی اس کی سمت شوق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ رک گئی۔

"بہت دیر سے تلاش کر رہا تھا میں تمہیں۔ کہاں چھپی ہوئی تھیں؟"

"نہیں' میں چھپی ہوئی کہاں تھی۔ یہیں سب کے سامنے۔"

"خیر' ویسے آج تمہیں چھپنا ہی چاہیے تھا۔ اس قدر حسن کے جلوے کون کافر برداشت...."

صامیہ کا حلق کڑوا ہو گیا۔ اس نے سختی سے جھڑک دیا۔ "چپ رہیے' بہت اترا گئے ہیں آپ۔"

"ہاں اترانا ہی چاہیے۔ آخر تم میری کزن ہو اور یہ رشتہ کسی دوسرے رشتے میں بدل سکتا ہے۔ امی تو بے قرار ہیں کہ کسی طرح تم کو اپنے گھر' اپنے آنگن کی زینت بنائیں۔" اطہر علی کے چہرے پر چمک تھی۔ لہجے میں کھنک مگر اسی وقت جانے کہاں سے واصف آ گیا۔ وہ اور اطہر دوست تھے۔ اس نے سختی سے صامیہ سے کہا۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟ ادھر غزالہ اکیلی بیٹھی ہے۔"

صامیہ کو اس کا یہ لہجہ عجیب لگا۔ وہ اس انداز میں تو کبھی مخاطب نہ ہوتا تھا۔ اسے غصہ آ گیا۔ تنک کر بولی۔

"میں اپنے کزن سے بات کر رہی ہوں۔ ویسے تو پھپھو کے گھر جانا ہوتا نہیں۔"

اطہر علی کا رنگ واصف کے جملے سے پھیکا پڑ چکا تھا۔ صامیہ کے جواب نے خوشی کی سرخی چہرے پر بکھرا دی۔ وہ ہنس کر بولے۔

"بھئی کبھی آجایا کرو نا۔ غریب خانہ کچھ اتنا دور بھی نہیں۔ یہاں تمہیں قید تو نہیں کیا گیا ہے نا!"

اطہر علی اور واصف اک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک تھی۔ صامیہ گھبرا کر وہاں سے ہٹ گئی۔ اسے خبر نہ ہوئی کہ بعد میں دونوں میں کیا گفتگو ہوئی۔ وہ غزالہ آپی کے پاس جا کر کونے میں بیٹھ گئی۔ اسے واصف کا لہجہ پسند نہیں آیا تھا۔ اس لہجے میں حکم تھا' زور تھا.... کیوں.... وہ واصف اور اطہر علی کے جملوں میں کھو گئی۔ اداسی نے اسے مکمل اپنے حصار میں لے لیا۔ مہندی کی رسم کے لیے غزالہ کو باہر لے جایا گیا۔ لالہ رخ نے اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ مگر وہ وہیں لیٹ گئی اور اکیلی کسی سوچ میں گم پڑی رہی۔ دیر بعد جب غزالہ رسموں کے بعد اندر لائی گئی تو صامیہ سو چکی تھی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

☼ ☼ ☼

عجیب بات یہ ہوئی کہ اس رات ایک لمبے عرصے کے بعد اسے پھر وہی خواب نظر آیا۔ لیکن اتنی تبدیلی کے ساتھ کہ روحوں کے باہم رقص میں وہ وہاں نہیں تھی۔ اس کا جذبہ بھی نہیں تھا۔ اور آخر میں اس نے پھر بوسیدہ ریکارڈ پر گھسی ہوئی سوئی کے رینگنے کے

ساتھ کسی پرانی مغنیہ کی فریاد سنی۔
"سنو سکھی سیاں جوگیا ہوگئے میں جوگن اس کے ساتھ۔"

سنو سکھی۔ جوگی نے چھائی جنگل جھونپڑی
جوگن نے چھایا پردیس۔

مغنیہ کی باریک آواز پرانے ریکارڈ نے یقیناً "موٹی" بنادی ہوگی۔ اسی دوران اس نے ایک صاف اور واضح آواز سنی۔

"ہم ہارنے کے لیے بازی نہیں لگاتے دوست!"

پھر منظر بدل گیا اور ہر سمت پرندے چہچہانے لگے۔ اور صبح کا ستارہ چمک کر ماند پڑ گیا۔ سورج کی کرنیں فضا پر حاوی ہوگئیں۔ کوئی اسے دور سے پکار رہا تھا۔ صامیہ! صامیہ! ہائیں۔ مگر یہ خواب نہیں تھا۔ صبح ہوگئی تھی اور کھڑکی سے آتی دھوپ کی چمک اسے چبھنے لگی تھی۔ لالہ رخ اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

"صامیہ! صامیہ!" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"جلدی سے آجاؤ۔ ناشتا لگ گیا ہے۔ تم نے رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔" لالہ رخ اسے مزید ہدایت دیتی ہوئی چل دی۔ شاید گھر میں کافی مہمان تھے۔ باہر سے آوازیں آرہی تھیں ہنسی کی، باتوں کی، برتنوں کے گرنے کی، چمچوں کے پلیٹ سے ٹکرانے کی اور بھی بہت سی۔

غزالہ کا ناشتا کافیہ لے کر آئی تھی۔ کافیہ نے سرخ رنگ کی گوٹا لگی چنری اوڑھی ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ گنگنا رہی تھی۔ صامیہ نے سستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"کافیہ! لالہ رخ سے کہنا میں یہیں کرلوں گی ناشتا۔ اب کون کپڑے بدلے لالہ رخ کہہ گئی ہے کہ میں تیار ہوکر باہر آؤں۔ مہمانوں کے سامنے اس کی ہیٹی نہ ہو جائے۔"

غزالہ ہنسنے لگی۔ "ہاں، اس کی تو ذرا سی بات میں ہیٹی ہوجاتی ہے۔"

کافیہ دانتوں میں دوپٹہ دبا کر ناز سے پوچھنے لگی۔ "آپی جی! یہ ہیٹی تو ہماری دیہاتی زبان کا لفظ ہے۔ آپ کی انگریزی میں بھی ہوتا ہے؟" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ صامیہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"کیا بات ہے؟ اب تو بات بات پر ہنس رہی ہو۔ کافیہ! کیا بیاہے ہوئے کافی دن ہوگئے؟"

"نا جی نا! ایسی بھی کیا بات ہے۔" وہ اترا گئی۔ "اب تو میں بھی اسے پیٹوں تو وہ برا نہ مانے۔"

"ہائیں... یہ انقلاب کب آیا؟" غزالہ ہنس پڑی۔

"بس جی ہمارے انقلاب تو آتے رہتے ہیں، جاتے رہتے ہیں۔" کافیہ موج میں تھی۔

"بڑا فلسفہ آگیا ہے۔ پتا تو چلے بات کیا ہے؟" صامیہ کو حیرت ہو رہی تھی۔ آج وہ خوش بھی تھی اور ترنگ میں بھی تھی۔ کافیہ اور ترنگ۔ دو الگ الگ معنی کے لفظ تھے۔

"میرا مطلب ہے جی۔ آپ صاحب لوگ تو بس انقلاب کو ایک دفعہ ہی آتا دیکھتے ہیں۔ پر ہم دیہاتی لوگوں کے تو انقلاب بس آتے جاتے رہتے ہیں۔ ابھی تو یہ انقلاب آیا ہے کہ وہ مجھے مارے بھی نہیں ہے اور ماں کی بھی نہ سنے ہے۔ میری ہر بات پوری کرے ہے۔ پھر سال بعد دوسرا انقلاب آجاوے گا۔ مارے گا بھی اور مانے گا بھی نا اور پھر دوسرا...."

"ارے ارے کافیہ! سانس تو لو بھئی۔ یہ دوسرا انقلاب کب آئے گا؟"

"جی۔ جب میرے دوسرا بچہ ہونے والا ہوگا۔" وہ بے حد شرما گئی۔

"آخاہ... تو پہلا بچہ آنے والا ہے۔ تبھی اس قدر ہنس رہی ہو۔" غزالہ اور صامیہ ہنس پڑیں۔ کافیہ شرما کر بھاگ گئی۔ وہ چائے پی رہی تھی۔ تو لالہ رخ بڑبڑاتی ہوئی آئی۔

"اُف صامیہ! اتنا کہا تھا میں نے کہ پلیز تیار ہو کر آجاؤ۔ میری کتنی سہیلیاں ہیں۔ جو تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ سچی میں نے اتنی تعریفیں کی ہیں ان سے تمہاری کل تو ہڑبونگ میں ملنا ہی نہ ہوسکا۔ رات یہیں رہ گئی تھیں۔ وہ اور تم ابھی تک میلی کچیلی بیٹھی ہو۔ رات کو

تو سو گئی تھیں۔ کپڑے کب بدلے تم نے؟"

"بس رات میں ہی آنکھ کھلی تو یہاں جو بھی ملے نظر آگئے۔ پہن لیے۔"

"بس تمہاری سستی مجھے پسند نہیں۔ کل وہاں اتنا مزا آرہا تھا مہندی میں تم یہیں پڑی رہیں۔ ہاں آپی! خوشخبری یہ ہے کہ چھوٹے چچا صاحب کی تشریف آگئی ہے۔ وہ تمہیں رخصت کرنے آئے ہیں۔ سنا ہے کہ پھر واپس چلے جائیں گے کام نپٹا کر اور اس قدر ردی حالت میں آئے ہیں کہ گھن آنے لگی ان کے حلیے سے چلو صامیہ! اٹھو... مجھے لگتا ہے تم میں بھی کچھ کچھ احمر اعظم والے جراثیم ہیں۔ سست الوجود کاہل۔"

صامیہ کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی پیالی خود بخود ہل گئی تھی۔ خوشخبری سنتے ہی چائے چھلک گئی اور وہ ہاتھ سے ہی کپڑے مسلنے لگی۔ غزالہ نے سر تھام کر کہا۔

"خدا کے لیے لالہ رخ! بولنے میں سانس تو لے لیا کرو۔ میں تو تھک گئی سن سن کر۔" لالہ رخ منہ بنا کر کھڑکی میں کھڑی ہوگئی۔ بولی۔

"سب نازک ہیں۔ تکلیف برداشت نہیں کرسکتے۔ کل سے کام کر کر کے، چل چل کے میرے گھٹنے ٹوٹنے لگے ہیں۔ سچ کوئی تعریف تو کرتا نہیں۔ اوپر سے چھوٹے چچا آگئے ہیں حکم چلانے کے لیے۔ آتے ہی ڈانٹ دیا۔ کہ چائے پلاؤ۔ میں انسان ہوں۔ کوئی بے جان تو نہیں ہوں۔ ابھی تو ناشتے سے فراغت ملی تھی۔ اب میں اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھوں یا کچن میں سر کھپاؤں۔ کہہ دیا ہے میں نے شرفو سے۔ وہ جانے اور چھوٹے چچا۔ سچ مجھے تو ان سے نفرت ہوگئی ہے۔ جس طرح انہوں نے صامیہ کی بے عزتی کی تھی۔ جی چاہتا تھا دھکے دے کر گھر سے نکال دوں۔"

"لالہ رخ! لالہ رخ!" غزالہ دبی دبی زبان سے ڈانٹنے لگی۔ "کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ وہ جیسے بھی ہیں ہمارے چچا ہیں۔ ابو کے عزیز بھائی ہیں۔ صامیہ نے تو پھر بھی ان سے شکوے کی بات نہیں کی۔ تم اس بات کو بھولتی ہی نہیں ہو۔ بری بات ہے۔ مجھے تو ان کی بے رنگ زندگی پر بڑا ترس آتا ہے۔"

"ہاں تم تو ضرور ترس کھاؤ گی۔" لالہ رخ چڑ گئی۔ "تمہاری رخصتی کے لیے تو آئے ہیں۔"

"خیر میں پہلے بھی ان سے نفرت نہیں کرتی تھی۔ جب بھی وہ آتے تھے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا۔ پردیسی اپنے گھر آگیا۔ جوگی منزل پر آپہنچا۔ وہ کہیں بھی جائیں۔ کتنے دن غائب رہیں۔ آخر کار آتو جاتے ہیں نا۔ اپنا گھر سمجھتے ہیں تو آتے ہیں۔ ورنہ کہیں بھی رہ جائیں۔ کسی بھی شہر میں بس جائیں کوئی کیا کرے گا ان کا۔"

لالہ رخ کے جانے کے بعد غزالہ، صامیہ کو چھوٹے چچا کے قصے سناتی رہی۔ "وہ بہت غمزدہ انسان ہیں۔ بے حد اکیلے ہیں۔ ابو کے سوا کسی کو اپنا نہیں سمجھتے۔ واصف خوامخواہ ان سے خار کھاتے ہیں۔ ورنہ وہ کسی کو دکھ نہیں دیتے بس غصہ آجاتا ہے تو چیختے چلاتے ہیں۔ برتن توڑتے ہیں۔ وہ بھی کسی وجہ سے۔ یا امی ان پر طنز کریں یا واصف کچھ کہہ دیں تب وہ بگڑ جاتے ہیں۔ کوئی ان سے محبت نہیں کرتا۔ کسی کو ان کے جذبات کا لحاظ نہیں۔ بڑے ہی بدنصیب ہیں چھوٹے چچا۔"

"میری طرح۔" صامیہ کے منہ سے نکلا۔ غزالہ اسے بھی ڈانٹنے لگی۔ بالکل بڑی بہنوں کی طرح۔ صامیہ ہنس دی۔

پتا نہیں وہ کیسی خوشی تھی۔ جو ہر سمت لہراتی محسوس ہو رہی تھی۔ درختوں کے سوکھے پتے کھڑکھڑاتے گرتے تو اس میں بھی جھنکار سی ہوتی۔ کہیں کوئی گلاس ٹوٹتا وہ بھی قہقہے لگاتا ہوا لگتا۔ لان میں جھاڑو دی جارہی تھی۔ اس میں سے بھی موسیقی پھوٹ رہی تھی۔ درختوں پر بلب اٹکائے جارہے تھے۔ پتے تالیاں سی بجارہے تھے۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ خوش تھے۔ اب سے پہلے کم از کم صامیہ کو کسی کی خوشی کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ غزالہ آپی کی شادی اس قدر دلچسپ ہوگی۔ اس نے کل تک تو یہ سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے ہر بات پر ہنسی آرہی تھی۔ انکل چائے کا کپ لیے اس کے قریب آبیٹھے۔ وہ بھی بہت مسرور نظر آرہے تھے۔ صامیہ نے انہیں اطمینان سے بیٹھے

دیکھا تو حیران ہو گئی۔

"انکل! آپ بہت خوش ہیں۔ غزالہ آپی کی شادی کی وجہ سے؟" اس نے پوچھ لیا۔

"ہاں بیٹا! پہلی خوشی تو فرض کی ادائیگی کی ہے۔ دوسری خوشی احمر کی واپسی کی۔ اس نے سارا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اب میں ذرا بے فکر ہو گیا ہوں۔"

"مگر سنا ہے وہ تو چلے جائیں گے۔"

"ہاں مسافر کو جانا تو ہے۔ مگر یہ کیا کم خوشی کی بات ہے کہ اسے اپنے فرض کا احساس ہوا۔ اسی لیے تو آیا ہے' جب جانا ہو گا چلا جائے گا۔ ورنہ تو میرے اکیلے کے بس میں تھا اتنا کام۔ شاید میں بیمار پڑ جاتا۔ تھک گیا ہوں۔"

صامیہ ہنس دی۔ "انکل اتنے دن سے کر تو رہے تھے آپ ہی سب کچھ۔"

انکل ہنس دیے۔ "ہاں' میں اس وقت اکیلا تھا۔ اب اکیلا نہیں رہا۔ اتنا فرق ہوا اور یہ فرق بہت بڑا ہے۔"

شادی دھوم دھام سے ہوئی۔ کھانے کا بہت اچھا انتظام تھا۔ بیٹھنے کا بھی سلیقے سے اہتمام کیا گیا تھا۔ روشنی بھی ہر سمت مناسب تھی۔ غزالہ شادی کرکے رخصت ہو گئی تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ انکل امیر اکبر اعظم تو کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ انہوں نے کہہ دیا کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ جو کچھ کہنا سننا ہو۔ احمر سے بات کرے۔ واصف نے منہ بنا کر کہہ دیا۔

"ہونہہ۔ سارا کام ابو کا ہے اور یہ حضرت انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھوانے آ گئے۔"

صامیہ نے اسے ٹوکا بھی۔

"یوں تو مت کہیے۔ جب سے آئے ہیں بے چارے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے تو انگلی بھی کٹانے کی زحمت نہیں کی۔"

واصف نے منہ سجایا۔ وہ باقاعدہ خفا ہو گیا۔ صامیہ کو ہنسی آنے لگی۔ لالہ رخ اور وہ ایک میز پر چڑھی بیٹھی تھیں۔ لان سے کرسیاں ہٹائی جا رہی تھیں۔ شامیانے تہہ کر دیے گئے تھے۔ برتن جمع کیے جا رہے تھے۔ دھل رہے تھے۔ گنے جا رہے تھے۔ لکھے جا رہے تھے۔ کوئی ٹوٹے بلبوں کا شمار کر رہا تھا۔ تو کوئی گھاس پر جھک جھک کر چمچے اور گلاس تلاش کر رہا تھا۔ اور مہتمم اعلا جناب امیر احمر اعظم سب کو ہدایتیں دے رہے تھے۔ کبھی اِدھر دوڑتے کبھی اُدھر آتے۔ کبھی گنتی کرا رہے ہیں تو کبھی کرسیاں ہٹوا رہے ہیں۔ میزیں کنارے رکھتے نظر آ رہے ہیں۔ صامیہ اور لالہ رخ بڑے آرام سے پیر لٹکائے میز پر بیٹھی تھیں جب کسی نے آ کر کہا۔ "میز خالی کر دیں جی۔ اودھر رکھنی ہے۔ آپ ادھر بیٹھ جائیں۔"

"ہم تو نہیں اٹھیں گے۔ یہیں بیٹھیں گے۔" لالہ رخ نے کہہ دیا۔

احمر تک شکایت پہنچی تو انہوں نے وہیں سے پکار کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ بچیاں بیٹھی ہیں انہیں ڈسٹرب نہ کرو۔ تھک گئی ہیں۔"

لالہ رخ منہ دبا کر ہنسنے لگی۔ "شاہ جنات کا موڈ بہت اچھا ہے۔ اوج ثریا پر رقص کر رہا ہے۔ تبھی ہم انہیں بچیاں نظر آ رہے ہیں۔"

"یہ تو غزالہ آپی کی شادی کا کمال ہے۔" صامیہ نے کہا۔ "سچ لالہ رخ! تمہاری شادی میں تو تمہارے یہ چچا رقص بھی کر سکتے ہیں۔"

"اور تمہاری شادی میں تو۔۔" لالہ رخ کہتے کہتے رک سی گئی۔ جلدی سے بولی۔ "ارے بھائی صاحب کی شادی پہلے ہو گئی بھئی۔ تب شاید چچا ڈانس بھی کریں۔"

"اور خود ان کی شادی کب ہو گی؟" صامیہ معصومیت سے بولی۔

"لو۔ ان سے کون شادی کرے گا۔ مطلب کون کرے گی۔ کوئی پاگل ہو گی۔"

"ہاں ان سے کون شادی کرے گا۔" صامیہ سامنے دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ احمر اعظم قلم اور کاپی لیے حساب میں مصروف تھے۔ واصف بھی آ کر میز پر ٹک گیا۔

"آپ بھی جا کر کام کریں نا! ہاتھ بٹائیں۔ چھوٹے

چچا کا۔" صامیہ نے اسے پھر چڑانے کو کہہ دیا۔

"تم کو بہت فکر ہے ان کی۔" وہ بیچ بچ بھنا گیا۔

"بھئی بچیو! چائے وائے کا بھی انتظام ہے یا بھوکا پیاسا ہی رُخایا جائے گا یہ مزدور۔"

احمر اعظم کہیں قریب سے ہی بولے۔ صامیہ جلدی سے اٹھنے لگی تو لالہ رخ نے اس کا شانہ دبا دیا۔ "آپ کھانا تو کھالیں چھوٹے چچا!" لالہ رخ نے لاپروائی سے کہا۔

"اب کھانا تو صبح ہی کھاؤں گا۔ مگر چائے کی طلب۔۔۔" وہ صامیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"اچھا ابھی بھیجتے ہیں آپ کے لیے چائے۔" لالہ رخ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ صامیہ تو جانا نہیں چاہتی تھی مگر وہ اسے بھی گھسیٹ لے گئی۔ اس کا رخ کمرے کی طرف تھا۔ صامیہ نے ٹوکا۔ تو وہ شرارت سے ہنس پڑی۔

"رہنے دو کرنے دو انتظار۔" اور صامیہ کو بستر پر لٹا کر خود بھی لیٹ گئی۔ کتنی دیر رات تک صامیہ کو نیند نہ آئی۔ یہ لالہ رخ کی شرارت نہیں خباثت ہی تو تھی۔ ایک پیالی چائے بنا کر دینے میں حرج ہی کیا تھا۔ نہ خود لالہ نے چائے بنائی نہ ہی اسے بنانے دی۔ حالانکہ مزدوروں کو بھی چائے دن بھر دی گئی تھی۔ خانساموں کے لیے تو باقاعدہ بڑا دیگچہ چڑھا ہی رہا۔ بے چارے نے صامیہ کو دیکھ کر چائے کی طلب کہا تھا۔ پتا نہیں کب تک انتظار کیا ہو گا۔ وہ مارے تاسف کے تمام رات جاگتی رہی۔

☼ ☼ ☼

حسب توقع صبح کو شاہ جنات کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ لالہ رخ منہ چھپائے بیٹھی تھی۔ صامیہ کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہی قید ہو گئی تھیں۔ صحن میں امیر احمر اعظم تشریف فرما تھے۔ شرفو کی شامت آئی ہوئی تھی۔ اُدھر واصف اور عارف تقاضا کر رہے تھے کہ امی کہتی ہیں۔ غزالہ کے لیے ناشتا جائے گا۔ تم لوگ تیار ہو کر آؤ۔ لالہ رخ تو تھی ہی ڈھیٹ۔ اس کے علاوہ وہ اس کے چچا تھے۔ پتا نہیں کس طرح ان کا سامنا کیا ہو گا۔ مگر صامیہ نے غزالہ کی سسرال جانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ باہر نکل کر احمر کا سامنا کیسے کرتی۔ ذرا سا کام ہی تو بے چارے نے کہا تھا۔ ایک منٹ میں تو چائے بنتی ہے۔ مگر لالہ رخ کی بچی۔ اسے بھی شرمندہ کر کے چھوڑا۔ عارف' واصف اور لالہ رخ ناشتے کے لوازمات کے ساتھ جا چکے تھے۔ آنٹی نے اسے ناشتے کے لیے بلایا تھا۔ وہ دبے پاؤں کھانے کے کمرے میں آ گئی اور چپکے سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میز پر ناشتے کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ کافیہ کو آواز دینے ہی والی تھی کہ رک گئی۔ ایک چھوٹی ٹرے میں چائے اور بسکٹ لیے احمر اعظم اندر داخل ہوئے۔ اور کرسی پر اس کے سامنے ہی ڈٹ گئے۔ انہوں نے بھی اسے بیٹھنے کے بعد دیکھا اور چونک گئے۔ وہ ندامت سے میز کھرچنے لگی۔

"ناشتا نہیں کیا ابھی؟" احمر اعظم بہت نرمی سے بولے تھے۔ مگر صامیہ اچھل پڑی۔

"جی! جی۔۔۔ جی نہیں۔" اس کے منہ سے نکلا۔ انہوں نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی۔

"یہ ناشتا کرو۔" وہ لاپروائی سے بولے تو صامیہ سٹپٹا گئی۔

"جی۔۔۔ آ۔۔۔ آپ کریں میں منگا لوں گی۔"

"نہیں ہم کو یہ چائے پینا پڑے گی۔ اگر انکار کرو گی تو میں زبردستی اپنے ہاتھ سے پلا دوں گا۔" ان کا لہجہ گرم ہو گیا تھا مگر آواز نیچی تھی۔ صامیہ کے ہاتھ لرزنے لگے۔ یا اللہ! یہ کیا مصیبت۔ "میں جانتا ہوں کہ میں نے خاص طور پر تم سے چائے نہیں مانگی تھی۔" وہ شکوے کرنے لگے۔

"مگر یہ نہیں مان سکتا کہ تم نے میرا اشارہ سمجھا ہی نہیں۔۔۔ خیر۔ ہر انسان اپنی قسمت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ شاید میرے نصیب میں کنکر پتھر ہیں۔ ٹھوکریں اور حقارت ہے۔" وہ کرسی سے کھڑے ہو کر ٹہلنے لگے۔ صامیہ کی جان نکلی جا رہی تھی کیسا بے موقع سامنا ہوا تھا اور وہ ان کی غلط فہمی رفع کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔

"ناشتا کرو۔ میں اور بنا لاؤں گا۔" وہ اس کے قریب

آکر بولے۔ تو صامیہ کا دل بھر آیا۔ بے تابی سے بولی۔
"آپ، آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا رات کو۔ اب ناشتا تو کرلیں۔"
"ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" وہ طنز اور تلخی سے بولے۔
"میں اکثر کچھ نہیں کھاتا اور کسی کو میری فکر نہیں ہوتی۔ رات آپ نے بھی۔۔۔ کل میرا دن بہت اچھا گزرا۔ میں کتنا خوش تھا۔ اپنوں میں۔ لیکن دن کی وہ مسرت اور اطمینان۔ ایک پیالی چائے کے عوض۔ اذیت بھری رات کے جہنم کی نذر ہو گیا۔ صرف ایک پیالی چائے۔" زہریلی ہنسی ان کے ہونٹوں پر ابھری۔
"خوشی کتنی ناپائیدار اور لمحے بھر کی ہوتی ہے اور دکھ پوری زندگی کو لپیٹ لیتے ہیں۔ میری زندگی ایسے ہزار دکھوں سے بھری ہوئی ہے اور اب میں اس کا عادی ہو گیا ہوں۔ بہر حال۔"
"میں معذرت نہیں کروں گی۔ اصل میں قصوروار تو میں ہی ہوں۔" صامیہ ہمت کرکے بول اٹھی۔
"مجھے پتا تھا آپ میرے ہاتھ کی چائے پسند کرتے ہیں۔ اور آپ تھکے ہوئے بھی تھے۔ لیکن یہ مجھے علم نہ تھا کہ میری لاپروائی آپ کی خوشیوں کی دشمن بن جائے گی۔ پلیز آپ اس بات کو بھول جائیے۔" وہ تاسف و لجاجت سے بولی۔ خلاف توقع احمر نے تلخی یا اشتعال کے مظاہرے کے بجائے لمبا سانس لے کر گویا وہ دکھ بھلا دیا۔
"اچھا چلو۔ مان لیا۔ اب تم ناشتا کرو یہ چائے میں تمہارے لیے ہی لایا تھا۔ میں تو صبح ناشتا کر چکا ہوں۔ میں نے سوچا تمہیں کچھ شرمندہ ہی کیا جائے۔" ہلکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ صامیہ تعجب سے انہیں دیکھنے لگی۔ عجیب انسان تھا یہ۔ وہ بسکٹ کھانے لگی اور چائے پینے لگی۔ احمر معصومیت سے اسے دیکھتے رہے۔
"میں نے سوچا تھا۔" وہ ناخنوں پر نظریں جمائے بول اٹھے۔ "تم بھی میری طرح کی ہو۔ بدنصیب جن کے محبت کرنے والے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور وہ حسرتوں کی دنیا آباد کر لیتے ہیں۔ یا پھر میری طرح مسافرت اختیار کر لیتے ہیں۔ آوارہ ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی نے تمہارا تعارف نہیں کرایا تھا۔ مگر مجھے اندازہ تھا کہ تم ہی شاہد بھائی کی بیٹی ہو سکتی ہو۔ میری ان سے۔۔۔ شاہد بھائی سے خاصی دوستی تھی۔ وہ مجھے پسند کرتے تھے۔" احمر نے نظر اٹھا کر صامیہ کو دیکھا۔ پھر چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہے نا عجیب سی بات، کوئی مجھے پسند کرے مگر یہ حقیقت ہے۔ تو اس وقت میں نے چاہا کہ میں تم سے کہوں۔ ہمارے دکھ۔ ہماری محرومیاں ایک جیسی ہیں۔ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ آؤ ہم دکھ بانٹ لیں۔ مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب تم مجھ سے لڑ رہی تھیں۔ مجھے بھی تاؤ آ گیا تھا اور میرے دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ زبان کی تلخی کے لیے میں ویسے بھی بدنام ہوں۔ اس دن تو مجھے غصہ آ ہی گیا تھا۔ مگر یہ واصف۔۔ اس کی زبان بھی کم نہیں ہے۔ زہر ہے اس کی زبان میں۔ وہ مجھ سے تمہاری طرف سے لڑنے آیا تھا۔ مجھے ہنسی آئی۔ مگر پھر میں چلا ہی گیا۔ وہ نواب ٹھہرا۔ جو چاہتا ہے منوا لیتا ہے۔"

"آپ کہاں چلے جاتے ہیں؟"
"کہیں بھی دل بہلانے کے لیے۔ جنگلی ہوں۔ جنگل جنگل پھرتا ہوں۔ اب شکار پر پابندی لگ گئی ہے۔ میں جنگل کے جانوروں سے دوستی کرتا ہوں۔ دنیا میں میرے دشمن بہت ہیں۔ جنگل میں دوست۔" احمر مسکرائے۔ "تم نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے۔ جو جانوروں کا دوست ہو۔ میں انسان ہوں۔ لیکن کوئی مجھے آدمی بنانے پر تیار نہیں۔"
احمر اچانک اٹھ کر باہر چلے گئے۔ صامیہ سوچتی رہ گئی۔ آدمی کیسے بنتے ہیں۔ کیا انسان الگ چیز ہے اور آدمی الگ؟

☼ ☼ ☼

اس روز سارے کام ختم کرکے۔ تمام بلوں کی ادائیگی کروا کے احمر اعظم پھر کہیں چلے گئے۔ کسی سے

کچھ کہے بغیر۔ غزالہ کے جانے کے بعد پھر حالات معمول پر آ گئے۔ لالہ رخ نے بی اے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب صامیہ کو یونیورسٹی جانا پڑتا تو اکثر واصف اسے موٹر سائیکل پر پہنچا آتا۔ کبھی وہ عارف کی خوشامد کرتی۔ کبھی انکل کے ساتھ چلی جاتی۔ کسی دن کوئی نہ ہوتا تو وہ چھٹی کرتی۔ آنٹی نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ اسے تنہا جانے کی عادت ہونی چاہیے۔ اس طرح تو اس کا بہت حرج ہوگا۔ مگر وہ بہت ڈرتی تھی۔ عجیب لگتا تھا۔ لالہ رخ ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ پھر یہ مسئلہ بڑھتا ہی گیا تو واصف نے ذمہ داری نبھانے پر اقرار کر لیا۔ واصف اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اکثر اس کی ضروریات کی چیزیں لا دیتا۔ روز موٹر سائیکل پر بیٹھ کر یونیورسٹی جانے اور پھر اسی کے ساتھ آنے میں خاصی بے تکلفی ہو گئی۔ صامیہ کو خبر بھی نہ ہوئی اور وہ واصف کا خیال رکھنے لگی۔ یہ احسان مندی نہ تھی۔ بدلہ بھی نہ تھا۔ لیکن اسے واصف میں کئی خوبیاں نظر آنے لگی تھیں۔ واصف بھی اس کے لیے کھلا دل رکھتا تھا شاید روزانہ کا ساتھ بھی ان کو قریب لے آیا تھا۔ ایک بار گوہر نے اس سے پوچھا۔
"کیا واصف ہی وہ شہزادہ ہے جو خوابوں میں آتا ہے؟" تو وہ ہنس دی۔
"نہیں میں حقیقت پسند ہوں گوہر! ان لوگوں نے میرے ساتھ بہت مروّت اور رواداری کا سلوک کیا ہے۔ میں ان کے احسان بھول نہیں سکوں گی۔ لیکن اس احسان کے بدلے۔ اپنے وقار کا سودا نہیں کروں گی۔"
"اور اگر انکل وغیرہ نے چاہا کہ تم ان کے گھر میں بہو بن کر رہو؟"
"ابھی تک تو چاہا نہیں ہے۔" اس نے ٹال دیا۔
مگر واصف نے اسے چاہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلی بار اس نے دبی زبان سے اظہار کیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ صامیہ برا نہ مان جائے۔ اس کی شکایت نہ کردے۔ ابو اس کی گردن دبا دیں گے۔ صامیہ کو ہنسی آ گئی۔ وہ اب ہنسنے لگی تھی۔ وقت نے زخموں کو مرہم دے دیا تھا اور وہ اب محرومی یا بے چارگی کی زندگی گزارنے سے گریز کر رہی تھی۔ کبھی امی بابا کا خیال آتا تو سوچتی۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ اتفاق سے میرے ساتھ ہوا۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آتے تھے۔ وہ کافی سنجیدہ ہو گئی تھی اور حالات کا مقابلہ کرنا اب اس کے لیے مشکل نہیں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وقت گزر رہا تھا' خزاں' بہار' دھوپ' سائے' رات' دن۔ وقت کبھی ایک حال پر نہیں رہتا۔ جب پہلی بار واصف نے اپنی پسند کا اظہار کیا تھا۔ وہ ہنسی تھی دوسری بار اس نے قسم کھا کر یقین دلایا۔ "میں تمہارے سوا کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ امی مجھ سے تقاضا کر رہی ہیں کہ کسی بھی لڑکی کا نام لوں جیون ساتھی کے لیے۔ اب بتاؤ۔ اگر تم کہو تو میں تمہارا نام لے لوں؟"

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ "کوئی زبردستی نہیں ہے۔ انکل آنٹی کو خود ہی اختیار دے دو۔ وہ تمہارے لیے بہتر فیصلہ کریں گے۔" اس نے رائے دی۔ واصف ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔
"شاید میں تمہارے معیار پر پورا نہیں اترتا۔" وہ مایوسی سے بولا۔ "مجھ میں خامیاں بھی ہیں۔ لیکن میں دل کی گہرائیوں میں تم کو چاہتا ہوں۔ جدھر دیکھتا ہوں تم نظر آتی ہو۔ مجھے زندگی کے لیے تمہارا ساتھ ہی چاہیے۔ سچ میری آنکھوں میں دیکھو۔ وہاں بھی تم ہو۔" وہ مسکرائی۔ اسے واصف نے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ صامیہ کے دل کی بات جان لیتا تھا۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا اور دلچسپ لطیفوں سے ہنساتا۔ وہ اس کے لیے پُرخلوص تھا۔ یہ اندازہ تو وہ کر سکتی تھی۔ پھوپھو انیقہ اس کے لیے شجرِ ممنوعہ بن کر رہ گئی تھیں۔ آنٹی نور افشاں گوہر کی شادی کے بعد گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔ اس کے ہمدرد عزیز جو تھے۔ وہ انکل امیر اکبر اعظم ہی تھے۔ ان کا پورا گھرانہ اس کو عزیز رکھتا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ ان پر سدا کے لیے

مبتلا ہو جائے۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے اب تھوڑی سی مدت درکار تھی وہ چاہتی تھی کہ انکل کا یہ بوجھ ہلکا کر دے۔ مگر اس سلسلے میں ابھی تک انکل یا آنٹی نے اسے مشورہ نہیں دیا تھا۔ وہ جتنا سوچتی الجھ کر رہ جاتی کہ وہ تعلیم ختم ہونے کے بعد کیا کرے گی؟ سروس ملنے کے بعد کہاں رہے گی؟ الگ رہنا مناسب ہو گا یا حسب معمول ان لوگوں کے ساتھ۔ اس کا اپنا گھر بھی تھا لیکن وہاں ماما اور بابا کی یادیں تھیں۔ ان کی آوازوں کی گونج تھی اور شاید ان کے سائے بھی ہوں گے۔ وہ اب مزید محرومیوں کے سائے میں نہیں رہ سکتی تھی۔ جو کچھ ہوا۔ اب وہ اس درد کو برداشت کر چکی تھی اس کے علاوہ وہ مہربان انکل آنٹی کے رویے نے اس کے درد کا مداوا بھی خوب کیا تھا۔ واصف بطور شریکِ حیات کچھ برا بھی نہ تھا۔ ہمدرد تھا۔ اور بقول اس کے محبت کرتا تھا۔ لیکن اسے انکل آنٹی کی خوشنودی کا خیال بھی تھا۔ اگر وہ ایسا چاہیں تو ہو سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ اسے قدرت نے عجیب سی قوت عطا کی تھی۔ وہ جذبات پر قابو رکھنا جانتی تھی۔ مگر ہوا کے جھونکے بھی اسے نویدِ محبت کی مبارک باد دینے لگے تو وہ چونک گئی۔ آنٹی نے خود اس سے بات کی۔ اپنی آرزو کا اظہار کیا۔

"تمہارے انکل دراصل احمر کے لیے تمہارا انتخاب کر چکے تھے۔" آنٹی نے بتایا۔ "اس وحشی جنگلی کو تم جیسی محبت کرنے والی لڑکی ہی راہ راست پر لا سکتی ہے۔ مگر ہم صرف نامزدگی کر سکتے ہیں اور چونکہ احمر کی کچھ خیر خبر نہیں اس کی رائے بھی نہیں لی ہے۔ واصف موجود ہے۔ اس پر ہم کو اختیار بھی ہے۔ اس لیے تم آزاد ہو۔ اگر واصف کے گھر کا اجالا بننا پسند ہو تو یہ انگوٹھی رکھی ہے پہن لینا۔ ورنہ اسی جگہ سے کل اٹھا لوں گی۔"

زندگی ایک انوکھے جذبے سے شناسا ہوئی تھی۔ اسے علم نہ تھا۔ محبت اتنی طاقت ور ہوتی ہے۔ خون میں روانی جوشِ محبت کی آئینہ دار تھی۔ ہر سمت پھولوں کی مہک اور رنگوں کی دھنک اس کے راستے سجاتی۔ گنگناتے ہوئے نظارے کس قدر قریب تھے۔ واصف نے اسے بہت حسین کنگن پہنایا تھا۔ مگر انکل اکبر اعظم کی خواہش تھی کہ وہ احمر کے آنے کے بعد ایک بڑے فنکشن میں منگنی کی رسم کریں۔ اور اب احمر کے انتظار میں وہ خوشیوں کے مستقبل کے خواب دیکھنے لگے۔ بڑا دل فریب ماحول تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ آنٹی کے چند الفاظ اس کے دل کی دنیا بدل دیں گے۔ ہر سمت واصف ہی نظر آتا۔ ہر کونے سے اس کی آواز سنائی دیتی۔ کیا یہ محبت تھی۔ اگر یہی محبت تھی تو جب واصف نے اظہار کیا تھا۔ تب تو وہ اتنی مضطرب کیوں نہ ہوئی۔ اسے یقین کیوں نہ آیا تھا۔ لیکن اب تو اسے زیادہ سوچنے کا بھی وقت نہ تھا۔ وہ واصف کے میٹھے الفاظ... مہکتے لہجے میں ہی گم رہتی۔ واصف بے حد مسرور تھا۔ لالہ رخ بھی نہال تھی صرف انکل امیر اکبر اعظم سنجیدہ تھے انہوں نے صاف طور پر اس سے کہا۔

"میں سمجھتا تھا۔ شاید تمہیں احمر سے ہمدردی ہو گی اور تم ہی وہ ہستی ہو گی جو اسے حسرتوں کی دنیا سے نکال کر محبت کے راستے پر لا سکو گی۔ مگر وہ ازلی بدنصیب ہے۔" وہ کافی مغموم تھے۔ صامیہ گم صم ہو گئی۔ بقول آنٹی کے۔ اس جنگلی کی ذہنی افتاد کا کیا ٹھکانہ۔ وہ شادی کے لیے انکار کر دے تو۔ یہ تو بڑی ذلت ہے لڑکی کے لیے اور جو عزت، احترام، خوشی اور تمنا کے ساتھ، چاہت کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہے۔ اسے اولیت دینی چاہیے۔

موسم سہانا تھا۔ اور جذبات میں سرخوشی اور خوشی دوبالا ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ پھوپھا منور علی خان نے بہت جھک کر منت کر کے اطہر علی کا رشتہ لالہ رخ سے کرنا چاہا تھا۔ آنٹی کو اطہر علی پسند تھا۔ منور علی خان ناپسند۔ لالہ رخ کے جواب پر رشتہ طے کر دیا۔

اب منور علی خان نے مطالبہ کیا کہ ہم اپنی بیٹی کا رشتہ اپنے گھر سے کریں گے اس لیے صامیہ کو ہمارے گھر آ جانا چاہیے۔ امیر اکبر اعظم کو اس میں کیا اعتراض ہوتا۔ صامیہ پہلی بار پورے اعتماد کے ساتھ انیقہ پھوپھو کے گھر آ گئی۔ پھر ایک روز وہ سب لالہ رخ کو انگوٹھی پہنانے گئے۔ بڑی محفل سجی تھی۔ انیقہ خوش تھیں۔ منور علی خان بھی چہک رہے تھے امیر اکبر اعظم آج بھی اداس تھے۔ ان کا چہیتا بھائی اب تک نہیں آیا تھا حالانکہ اسے کئی جگہ اطلاع بھیجی گئی تھی۔ اس کا ایک ٹھکانہ تو نہ تھا۔

آنٹی کا تقاضا اور اصرار تھا کہ اگلے ہی دن واصف اور صامیہ کی منگنی کی رسم بھی ہو جائے۔ اس طرح لالہ رخ کو انگوٹھی پہنا کر صامیہ پھر پھوپھو کے گھر آ گئی۔ حالانکہ اس کا دل چاہتا تھا وہ وہیں رہے۔ انکل کی دلجوئی کرے۔ وہ بہت بکھرے بکھرے لگ رہے تھے۔ اسے واصف کی قربت کا اتنا خیال نہ تھا جتنا انکل کو خوش دیکھنے کی تمنا تھی۔ وہ ان سے باتیں کر کے تسلی دینا چاہتی تھی۔ امیر اکبر اعظم کے دل پر بوجھ سا تھا۔ حالانکہ وہ لالہ رخ کی منگنی سے بہت مطمئن بھی تھے۔ لیکن بار بار انہیں احمر کی محروم تمنا زندگی کا افسوس ہوتا۔ پچھلی بار جاتے ہوئے وہ انہیں اشارہ دے گیا تھا۔ وہ ایسے بھائی تھے کہ اس کی اس تمنا کو بھی حسرت بنانے میں حصہ لے رہے تھے۔ خود صامیہ کا طرزِ عمل بھی انہیں مایوس کر رہا تھا۔ وہ کسی سے کیا کہتے۔ مجرم بنے ایک ایک کی خوشی بھانپ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

پھوپھا منور علی خان نے دنیاداری نبھانے میں کمال حاصل کیا تھا۔ ان کے بڑے سے لان میں مخملی کرسیاں سے رکھی گئی تھیں۔ سامنے ایک خوب صورت اسٹیج بنایا گیا تھا۔ ہر پیڑ پر رنگین قمقموں کا جال سا تھا۔ روشنی تھی۔ بہار تھی۔ حسن اور خوشی تھی۔ دراصل اس محفل میں امیر اکبر اعظم اطہر علی کو انگوٹھی پہنانے والے تھے۔ بعد میں وہ صامیہ کو اور منور علی خان واصف کو اسی رسم کے مطابق انگوٹھی پہنانے والے تھے لالہ رخ ابھی محفل میں نہ تھی۔ صامیہ کو اس کی کمی کھل رہی تھی اس نے انیقہ پھوپھو سے کہہ دیا کہ وہ لالہ رخ کے بغیر کوئی رسم نہ ہونے دے گی۔

یہ بات آنٹی سعدیہ تک پہنچی تو وہ خوش ہو گئیں۔ باہم رضامندی سے یہ طے پا گیا کہ اطہر علی اور واصف کو انگوٹھی پہنا دی جائے اور بعد میں لالہ رخ کو بلا لیا جائے۔ وہ واصف کی بہن کے طور پر ہی نہیں صامیہ کی عزیز سہیلی کے رشتے سے اس کے قریب بیٹھے گی۔ جب بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اطہر علی انگوٹھی پہنا دی اور عارف کو لالہ رخ کو لانے کے لیے دوڑا دیا گیا تاکہ رسم مکمل کی جا سکے۔ صامیہ لالہ رخ کے انتظار میں پچھلی طرف صحن میں ٹہلنے لگی۔ کمروں میں لڑکیوں کے جمگھٹے تھے۔ کچھ گانا گا رہی تھیں۔ حلق پھاڑ رہی تھیں۔ کچھ خوامخواہ قہقہے لگا رہی تھیں۔ نقلی قہقہوں سے صامیہ کو ہمیشہ چڑ رہی۔ اس نے تو ابھی تک اپنا وہ گلابی ٹشو کا لباس بھی نہیں پہنا تھا جو آنٹی اس کے لیے لائی تھیں وہ نیم تاریک صحن میں ٹہل رہی تھی۔

ایک کمرے میں لڑکوں کی ٹولی قہقہے لگا رہی تھی۔ یہ کمرہ اطہر علی خان کا تھا۔ اس نے واصف کی آواز بھی پہچان لی تھی اور مسکرا دی۔ یہ آواز اسے بہت اچھی لگی۔ اپنی اپنی۔ جیسے بہار کا کوئی شگوفہ مسکرا دے۔ جیسے کوئی ستارہ جھلملا کر اپنے وجود کا اظہار کرے یا جیسے کوئی تمنا اپنی مراد پا لے۔ صحن میں ہلکی سی خنکی تھی اور گل شبو کی بھینی بھینی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے بے خیالی میں بلکہ خیالوں میں ڈوبی ہوئی عین کمرے کی کھڑکی کے سامنے پہنچ گئی۔ وہ کھڑکی جو اطہر علی کے کمرے کی تھی۔ صامیہ کی سماعتوں میں کوئی بھولی ہوئی آواز۔ ایک ہلکی سی صدا۔ اسے خیالوں سے باہر لے آئی۔ یہ یہ کون یہ کس نے یاد دلایا تھا۔ اس کا بھولا ہوا وہ خواب۔ وہ نغمہ۔ مغنیہ کی باریک آواز۔ جو پرانے گراموفون کی گھسی ہوئی سوئی کے لگنے سے موٹی اور بیٹھی ہوئی لگ رہی تھی۔ ہاں یہ وہی آواز تھی وہی نغمہ تھا۔ "سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ میں جوگن اس کے ساتھ۔" وہ کھڑکی کی سمت لپکی۔ ادھر سے ہی گیت کے بول آسانی سے سننے جا

سکتے تھے۔ مغنیہ گا رہی تھی۔ الاپ رہی تھی۔ "جوگی بجائے بین اور بانسری۔ جوگن گائے ہے ملہار۔" کتنا پرانا لہجہ کیسا ٹھہرا ٹھہرا انداز تھا۔ اس نے ایک اینٹ پر پیر جما دیے۔ کھڑکی پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے پٹ نیم وا تھے۔

"جوگی نے پہنے گیروا کپڑے جوگی نے پہنے گیروا کپڑے۔ جوگن کے لمبے لمبے بال۔ سنو سکھی سیاں"۔

پنکھے کی ہوا سے پردہ ہلا تھا۔ اس نے نیم وا پٹ کے عین سامنے اطہر علی اور واصف کو دیکھا تھا۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا ایک بار جی چاہا۔ وہ انہیں پکارے۔ پھر ان کی پریشانی کا لطف لے۔ اطہر علی کے عقب میں ایک میز پر منور علی خان کا وہ پرانا گراموفون موجود تھا۔

ارے اسے پہلے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ گراموفون تو پھوپھا جان کے پاس تھا۔ اسے خواب میں گانا سنائی دیا تھا۔ گراموفون نظر نہیں آیا تھا۔ ورنہ شاید وہ پہچان لیتی۔

کتنی عجیب بات ہے۔ اس نے خواب میں یہ گانا کیوں سنا تھا؟ شاید کبھی۔ پہلے بھی سنا ہو۔ اس کے تحت الشعور میں موجود ہو۔ خواب اسے یاد ہی کب رہتے تھے۔ جانے یہ خواب کیوں یاد رہ گیا۔ اطہر علی اور واصف شطرنج کھیل رہے تھے۔

واصف نے قہقہہ لگایا اور اطہر کے شانے پر ہاتھ مار کر پر لطف لہجے میں بولا۔ "دیکھا ہم ہارنے کے لیے بازی نہیں لگاتے دوست۔" سن سن سن۔ کتنے لمحے سرسراتے گزر گئے۔ خواب کی یہ آواز۔ واصف کی آواز ہوگی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

کیوں؟ آخر کیوں؟ خواب کسی وجہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی جواز ہوتا ہے۔

"ہاں مان گئے استاد۔" اطہر علی کہہ رہے تھے۔

"تم نے صامیہ کے حصول کے لیے بھی شرط لگائی تھی۔ ہم ہار گئے تم نے بازی جیت لی۔"

"ہم' بازی صرف جیتنے کے لیے ہی لگاتے ہیں مگر۔۔۔" واصف چبا چبا کر بول رہا تھا "اس بازی میں تم میرے مقابل نہ تھے دوست میرا مقابلہ چھوٹے ابا سے تھا۔ سمجھے میں نے بے چارے کو ایک ہی وار میں لٹا دیا۔ ابا کا کوئی خط ڈاک میں نہ ڈالا۔ جو انہوں نے خود ڈاک خانے جا کر ڈالا بھی۔ وہ اپنے یار پوسٹ ما[سٹر] رضی کی مہربانی سے بالا ہی بالا نکلوا لیا۔ کہو کیسی رہی۔ ابا بڑی خوشامد کر رہے تھے میری "نواب دیکھ یار تو تو ہی نواب ہے تیرے لیے لڑکیوں کی کیا کمی ہمارے حالات ہماری قسمت ایک جیسی ہے۔ اسے مجھ سے ہمدردی ہے۔" سنا تم نے کہہ رہے تھے صامیہ کو ان سے ہمدردی ہے۔ میں نے کہا۔ "آپ ہمدردی کی بات کر رہے ہیں۔ میں اسے خود سے محبت کرنے پر بھی مجبور کر سکتا ہوں۔ بس لگ گئی بازی اور دیکھا تم نے۔"

"مگر یہ دیر کیوں ہو رہی ہے یار! کہیں بازی پلٹ نہ جائے۔" اطہر علی نے خدشہ کا اظہار کیا۔

"لالہ رخ کو بلایا ہے نا۔ اس کے بغیر وہ انگوٹھی نہیں پہنیں گی ہاہاہا۔" واصف بے تکے انداز سے ہنسا۔

"اب بازی ہمارے ہاتھ ہے۔"

"مگر یار! پھر وہ تیری عمرانہ نقی کا کیا بنے گا۔ اس پر بھی تو نے بازی لگائی تھی۔" اطہر فکرمندی سے کہہ رہا تھا۔

"چپ یار' دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" واصف جلدی سے بولا۔ "تو اس کی فکر مت کر۔ وہ بھی اپنی ہے منگنی میں یہی تو مزا ہے۔ شادی ہونے تک دو چار اور بازیاں لگ جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔" ایں دونوں زور سے ہنسے۔ صامیہ کا سارا جسم پتھر کا ہو [گیا] تھا۔ کانوں میں مغنیہ کی آواز کسی دردناک چیخ کی ما[نند] چبھ رہی تھی۔ اس کے آس پاس درندوں کے غرا[نے] کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ "قہ قہ قہ کیا مضائقہ ہے ہے ہے۔"

رات کی مہکی ہوئی فضا کس حادثے کی نذر ہو گئی تھی؟ ستاروں کی جھلملاہٹ آگ کے شعلوں میں [بدل] گئی تھی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ پھول کیوں سنگ[...] ہیں۔ میرے دل پر یہ کیسا الاؤ دہک رہا ہے؟ کیا ہو[...]

ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس کے حلق میں چیخیں منجمد ہو گئی تھیں۔ وہ چیخنا چاہ رہی تھی۔ مگر آواز جانے کہاں تھی۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔" کون کہہ رہا تھا۔ وہ اس آواز سے اس صدا سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔ خواب کی اس بھیانک تعبیر نے اسے آسمان سے اٹھا کر زمین پر لا پٹخا تھا۔ لمحے بھر میں موسم بدل گیا تھا۔ ہر سمت الاؤ جل رہے تھے۔ اس کے پیروں تلے انگارے چٹخ رہے تھے۔ وہ وہاں سے بھاگتی چلی گئی۔ بھاگتے بھاگتے جانے کہاں پہنچ گئی تھی۔ کسی نے اسے گرنے سے بچا لیا تھا۔

"کون ہے کون ہے؟"

وہ کون تھی؟ ایک مہرہ؟ شطرنج کا معمولی سا مہرہ؟

"ارے صامیہ بیٹی! کیا بات ہے؟" امیر اکبر اعظم نے اسے پرشفقت بانہوں میں بھر لیا تھا۔

"مجھے تو لگ رہا ہے انہوں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ آپ ان کی آنکھیں تو دیکھیں۔"

"کیا ہوا صامیہ! کس سے ڈر گئی ہو؟"

تب اس نے ارد گرد نظر دوڑائی۔ اور اسے لگا وہ آگ کے دریا کو پار کر آئی ہے۔ پھوپھا منور علی کے گیٹ کے باہر ٹیکسی کھڑی تھی۔

"میں تو ابھی اندر سے باہر نکلا کہ دیکھوں عارف نے اتنی دیر کیوں کر دی۔ رسم میں دیر ہو رہی ہے۔" انکل جانے کس سے کہہ رہے تھے۔ "تم نے دیر کر دی احمر!"

"احمر۔ احمر!" صامیہ کے سینے پر رکی ہوئی چیخ پورے جذبے سے باہر آئی تھی۔ انکل نے اس کا منہ اپنے سینے میں چھپا لیا۔

"بیٹی کیا ہوا؟" وہ گھبرا گئے تھے۔

"میں تو ابھی گھر پہنچا تھا۔ لالہ رخ نے بتایا کہ واصف کی نسبت طے ہو رہی ہے۔ اس موقع پر اپنی شرکت کے خیال سے۔ بھائی جان آپ کے [illegible] آپ کے خیال سے میں بھی فوراً چلا آیا۔ آپ ان کو دیکھیں۔ کوئی بات ضرور ہے کہ..."

"مجھے، مجھے یہاں سے کہیں اور لے چلیں انکل مجھے یہاں سے دور لے جائیں احمر!" صامیہ انکل کے جھنجوڑنے پر اتنا ہی بول سکی۔ ابھی اس کے حواس قائم نہ تھے۔ پتا نہیں اس کے چہرے پر کتنا دکھ تھا۔ اس کے لہجے میں کیسی تمنا تھی۔ حسرتیں تھیں۔ منتیں تھیں کہ انکل نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا۔ وہ اسے بازو سے تھام کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور احمر کو آگے بیٹھنے کا اشارہ کر کے صامیہ کو نرمی سے چمکارنے لگے۔ جیسے کسی چھوٹی سی بچی کو دلاسا دے رہے ہوں۔ تب صامیہ ان کے سینے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور ٹوٹے جملوں سے آپ بیتی سنانے لگی۔ تب امیر اکبر اعظم نے دوسرا اور فوری فیصلہ بھی کر ڈالا جسے سن کر صامیہ کے آنسو خود بخود رک گئے مضطرب دل کو قرار آ گیا۔ وہ پرسکون ہو گئی۔ جیسے اسی کے لیے اس نے یہ ڈرامہ رچایا تھا۔ اور جسے سنتے ہی امیر احمر اعظم چیخ پڑے تھے۔

"میں اس قابل نہیں ہوں بھائی جان میں تو تنہا اور مسافر ہوں۔ جنگلی ہوں میں کسی کے ساتھ نہیں چل سکوں گا آپ۔"

"میں جانتا ہوں۔" امیر اکبر اعظم پیار سے کہنے لگے۔

"تم انسان ہو اور تمہیں آدمی بنانے کے لیے صامیہ کی ہمراہی کافی ہے۔ میرے جوگی بھائی! دنیا سے کب تک بھاگتے رہو گے۔ کسی کے خلوص کو پرکھنے کے لیے اس سے دور رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

صامیہ کو لگا جیسے وہ اسی لمحے کی منتظر تھی۔ جیسے پرانے گیت کی مغنیہ اسی کے لیے وہ نغمہ الاپ رہی تھی۔ خواب کی تعبیر تو اب ملی تھی۔ "میں جوگن تیرے ساتھ۔"

رات ایک بجے جب آنٹی سعدیہ اور واصف تھکے ہارے گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے حیرانی سے لاؤنج میں بیٹھے لوگوں کو دیکھا۔ لالہ رخ کا چہرہ سپاٹ تھا مگر اس کی آنکھیں بھیگی بھیگی تھیں۔ عارف میز چڑھا بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ امیر اکبر اعظم، صامیہ کے گرد

بازو ڈالے اسے سمجھا رہے تھے اور صامیہ گردن جھکائے مسکرائے جا رہی تھی۔

"یہ، یہ کہاں تھی۔ وہاں ہم نے سارا جہان چھان مارا۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"اور آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ عارف! تم کو لالہ رخ کو بلانے بھیجا تھا یا..."

امیر اکبر اعظم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے ہی روکا تھا انہیں۔"

"اور آپ وہاں سے..."

"دراصل..." وہ کچھ مسکرائے تھے۔ "ادھر تو واصف کی منگنی کا بکھیڑا تھا۔ مگر یہاں..." انہوں نے صامیہ پر محبت کی نظر ڈالی۔ "یہاں احمر کا نکاح تھا۔ میرے لیے احمر کی تقریب میں شرکت ضروری تھی۔ لالہ رخ اور عارف بھی اسی لیے رک گئے تھے۔ دراصل احمر کو جو ملازمت اب ملی ہے اس میں غیر ضروری تعطیل کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے یہ اسی وقت روانہ ہو رہے ہیں۔ میں تمہارا منتظر تھا۔ اپنی بچی کی رخصتی کے وقت۔ تمہاری موجودگی بھی ضروری تھی سعدیہ بیگم! اٹھو بیٹی!" انہوں نے صامیہ کو اٹھایا۔ آنٹی سعدیہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ آواز حلق میں اٹک گئی۔ واصف دو قدم آگے بڑھا۔ اس نے اضطراب سے باپ کو دیکھا۔

"صامیہ، صامیہ!" وہ لپکا۔

"یہ صامیہ نہیں تمہاری چچی ہے۔ سلام کرو بدتہذیب۔" واصف سٹپٹا کر ہاتھ ماتھے پر لے گیا۔ عارف کو زور کی ہنسی آ گئی۔

"نکاح ہوئے تو دیر ہو چکی۔ مہمان اور قاضی صاحب جا چکے ہیں۔ اب رخصتی ہونی ہے۔"

احمر اعظم اپنے بھائی کے شانہ بہ شانہ کھڑے تھے۔ سنجیدگی سے واصف سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھے اور چپکے سے بولے۔ "نواب ہر چیز جاگیر نہیں ہوتی۔"

"اور..." امیر اکبر اعظم نے بردباری سے کہا۔ "جان دار لڑکیوں کو شطرنج کا مہرہ سمجھنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے ہم بازی ہار بھی سکتے ہیں۔ میرے بیٹے! تم ہار گئے ہو۔ جو بازی فریب پر کھیلی جائے ہاری جاتی ہے۔" عارف نے وہیں سے ایک چھوہارا واصف کی سمت پھینکا۔ اف ان چھوہاروں کے حصول کے لیے بے چارے عارف کو کیا پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ دکان کھلوائی دوگنے دام دیے پھر بھاگتا ہوا آیا۔

"اف یہ شادی، بیاہ، نکاح کس قدر مشکل سے ہوتا ہے۔ اپنی توبہ۔" اس نے کان پکڑے واصف مسمرائزم کے تحت کھڑا تھا۔ گم صم کوئی آواز کوئی حرکت اس کے لیے بے معنی ہو چکی تھی۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ سب لوگ باہر تھے۔ صامیہ کی رخصتی ہو رہی تھی۔

☼

تین دن، تین راتیں کھڑے کھڑے یا ٹہلتے ہوئے گزر گئی تھیں۔ دن کا اجالا ہو یا رات کی تاریکی اس کو کوئی فرق محسوس نہ ہوتا۔ انیقہ بستر سے سر اٹھا کر اسے دیکھتیں اور چمکار کر کہتیں۔

"اب بس کرو میری جان! ذرا دیر کے لیے لیٹ جاؤ میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں سلا دوں گی آؤ۔"

وہ بھلا کس کی سنتی تھی۔ اس کی سماعت بھی متاثر ہوئی تھی۔ پتا نہیں کس طرح ڈاکٹر اخلاق نے اس کے بازو میں انجکشن کی سوئی گھسا دی۔ اس نے مزاحمت تو بہت کی تھی مگر اخلاق کے ساتھ انیقہ، گوہر اور موٹی نرس نے اسے قابو کر ہی لیا تھا۔ چند منٹ بعد اس پر غنودگی طاری ہوئی تو وہ بے خبری میں ایک بستر پر گر گئی۔

نیلگوں روشنی میں وسیع باغ کے پیڑ، پودے اور ان پر کھلے پھول اور لگے ہوئے پھل بہت دلکش اور خوشنما نظر آ رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور ان سے پھوٹتی ہلکی ہلکی مہک بے حد خوش آگیں تھی۔ مست فضا اور روشن ماحول۔ ہر سمت سے خوشی کے فوارے اچھل رہے تھے۔ جانے اس موسم اور اس ماحول میں کیسی طرب ناک موسیقی کی دھیمی لے صدائیں بن کر سماعت اور احساس کو چھیڑ رہی تھیں کہ دل، جسم اور آنکھیں خود بخود رقص کرنے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ آنکھیں امنگوں کی داستان سنا رہی تھیں۔ روح ہلکی پھلکی ہو کر محو پرواز تھی۔ نیلے آسمان کے افق پر گلابی روشنی کے جھماکے ہو رہے تھے اور باغ میں محو خرام خوب صورت جوڑے روشنی میں نہائے ہوئے فرشتوں کی مانند پاکیزہ اور مقدس لگ رہے تھے۔ روشنی کے رنگوں میں اجلا پن تھا۔ کبھی نیلا، کبھی آسمانی، کبھی گلابی اور کبھی سرخ۔ شوخ اور چمکدار کرنیں ہر رخ اور ہر کونے میں ناچتی پھر رہی تھیں۔ موسیقی کی لے رفتہ رفتہ بلند ہونے لگی اور وہاں موجود خوش و خرم جوڑے رقص کرنے لگے۔ تب اس نے ایک آواز سنی۔ ایک گیت تھا۔ ایک نغمہ، خوشی سے کھنکتا ہوا۔ مسرت کے سازوں میں لپٹا ہوا۔ وہ گیت سنتی رہی۔ بے خودی میں مسکراتی اور ناچتی رہی۔

وہیں ان بے شمار لوگوں میں اس کے پیارے بابا اور حسین ممی بھی موجود تھے۔ وہ بھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رقص کر رہے تھے۔ خوشی ان کے جسموں سے روشنی بن کر پھوٹ رہی تھی۔ آسمانی رنگ کی کرنیں انہیں لپیٹے ہوئے تھیں۔ انہوں نے ایک بار بھی اسے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ پکارا تک نہیں۔ بس دونوں موسیقی کی لے پر متوازن قدموں سے رقص کر رہے تھے۔ اس نے پکارا۔ "بابا! ممی!" مگر موسیقی کی تیز آواز میں کسی نے اس کی آواز نہ سنی۔ وہاں تو سب ہی جوڑے تھے۔ مرد و عورت، عورت مرد۔ وہ ان کے گرد گھومنے لگی۔ بابا اور ممی کو پکارتی ہوئی۔ گروہ رقص کا دائرہ مکمل کر کے دوسری سمت گھوم گئے۔ پھر کسی نے اسے ڈانٹا۔

"چلو ہٹو۔ جاؤ یہاں سے۔ تم اکیلی ہو اور یہاں کوئی اکیلا جسم نہیں آ سکتا۔ بھاگ جاؤ۔"

وہ بے حد سراسیمہ ہو گئی۔ ڈانٹنے والا اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

"میرے بابا کہاں ہیں۔ ماما کہاں ہیں؟" وہ چیخ پڑی۔

"وہ یہاں ہیں۔" کسی آواز نے کہا۔

مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ یوں تو وہاں بہت سے لوگ تھے مگر وہ نہ کسی سمت متوجہ تھے۔ نہ ان کے چہروں پر گفتگو کا کوئی اثر تھا۔ لگتا تھا وہ نہ اس کی آواز سن رہے ہیں نہ اسے ڈانٹنے والے کی۔

"تمہارا ساتھی نہیں ہے۔ اس لیے تم یہاں نہیں آ سکتیں۔ جاؤ۔ جاؤ۔" پھر بہت سی آوازیں اسے ڈانٹنے لگیں۔ "جاؤ جاؤ۔"

وہ رونے لگی۔ بے بسی اور مایوسی نے اسے دل گرفتہ کر دیا۔ میں کہاں جاؤں؟ کوئی ان دیکھی طاقت اسے پیچھے دھکیل رہی تھی۔ اس خوب صورت دلفریب باغ اور وہاں کی خوشنما بہاریں۔ خوشیوں کے نغمات اور رقصاں بدن اس سے بہت دور ہوتے گئے۔ پھر ایک گونجتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہم ہارنے کے لیے بازی نہیں لگاتے دوست۔"

اور اس کے ساتھ ہی کسی پرانے ریکارڈ کی گھسی ہوئی آواز سرسرائی۔ کوئی باریک آواز والی مغنیہ اپنی تیز آواز میں گا رہی تھی۔

"سنو سکھی سیاں، ہو گیا ہو گئے۔"

"میں جو گن تیرے ساتھ۔ سنو سکھی سیاں۔"

گیت جاری تھا اور پرانے ریکارڈ پر گھسی ہوئی گراموفون کی سوئی اپنی گھس کے ساتھ ساتھ مغنیہ کی آواز کو بھاری بنانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

کوئی دور سے پکارتا ہوا آ رہا تھا۔

"صامیہ... صامیہ... صامیہ!"

روشنی کا تیز جھماکا اس کی آنکھوں سے ٹکرایا تھا وہ بدحواس ہو گئی۔ سٹپٹا کر اس نے پلکیں جھپکیں اور حیرانی سے اپنے سامنے بیٹھی انیقہ پھپھو کو دیکھا۔

"صامیہ! بیٹی اب اٹھو۔"

وہ اب تک کہاں تھی؟ گیت کے بول ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس نے یہ گیت آج تک کہیں نہیں سنا تھا وہ کس دنیا کا سفر کر کے آئی ہے۔ کیا اس نے جو دیکھا تھا وہ باغ بہشت تو نہ تھا؟ وہاں اس نے روحوں کو مسرت سے بے خود دیکھا تھا؟ اپنے بابا اور ممی کو۔ خوش و خرم۔ اپنی بیٹی سے بے نیاز۔ جس پر قیامت گزر گئی تھی۔

اسے پتا چلا۔ وہ متواتر دو دن سوتی رہی۔ متواتر دو دن اور راتیں۔ ڈاکٹر اخلاق نے تو اسے سکون کا انجکشن لگایا تھا۔ پھر اسے کیا ہوا تھا؟ سب پریشان ہو گئے تھے آنٹی نور افشاں نے اخلاق کو دھمکی دی تھی کہ اگر بچی کو "کچھ" ہو گیا تو وہ ذرہ بھر رعایت نہیں کریں گی۔ اخلاق خود بھی پریشان تھا۔ لیکن وہ مطمئن تھا۔ صامیہ کی نبض، بلڈ پریشر اس کی صحت مندی کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ سو گئی تھی۔ اس کے اعصاب سو گئے تھے۔ لیکن دو دن کی نیند اور آرام نے اسے چاق و چوبند کر دیا۔ اور ذہن پر پہلے جیسا بار نہ رہا۔ آنٹی نور افشاں نے اسے چائے پلائی۔ انیقہ پھپھو نے کھانا کھلایا۔ ڈاکٹر اخلاق نے گلوکوز کے ساتھ کوئی گولی دی [illegible] سب کچھ کھاتی چلی گئی۔ شاید اعصاب [illegible] تھے یا اس نے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ خاموشی سے سب کو دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

آنٹی نور افشاں مسلسل اخلاق کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ گوہر گھر میں موجود لوگوں کو چائے پلانے میں مصروف تھی۔ انیقہ پھپھو پلنگ پر بیٹھی بستر کے دھاگے نوچ رہی تھیں۔ ان کے ماتھے پر سوچ بچار کی لکیریں نمایاں تھیں۔

صامیہ جانتی تھی وہ کیا سوچ رہی ہیں۔ انہیں اپنے رشتے اور صامیہ پر پڑنے والی اچانک افتاد کے درمیان خلا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس خلا کو کیسے پر کر سکتی ہیں۔ یہی سوچیں انہیں پریشان کر رہی تھیں۔ دیکھا جائے تو سب سے بڑے نسب سے گہرے اور قریبی رشتے کے باعث وہی صامیہ کی سرپرست ہو سکتی تھیں۔ مگر منور علی خان کے بدمزاجی، کنجوسی، رشتے داروں سے لاتعلقی اور بیوی بچوں سے بھی اصرار کہ وہ بھی کسی سے ملیں نہ کسی کے کام آئیں۔ انیقہ جانتی تھیں۔ کسی بھی مہمان کی خاطر تواضع انہیں بہت مہنگی پڑتی ہے۔ منور علی خان کو کسی ایسے مہمان کی آمد اپنے گھر میں ناگوار گزرتی تھی جو چائے یا کھانے کے وقت حاضری دیں یا جن کو انیقہ یا ان کا بیٹا اہمیت دے۔ "لازماً" ایسے مہمان کی تواضع تو کرنا ہی پڑتی تھی۔ پھر بعد کی مدت کس مشکل

اور وقت سے پیسے گن گن کر بچا بچا کر گزارنی پڑتی۔

انیقہ اپنے اوپر گزرنے والی ہر مشکل کی وجہ جانتی تھیں اسی لیے وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتی تھیں جس سے بدمزگی اور الجھن پیدا ہو اور صامیہ کے ماں باپ نے مر کر کچھ ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ وہ صامیہ کے سر کا سائبان بننے سے ہچکچا رہی تھیں۔ ان کے سوا کوئی قریبی عزیز نہ تھا جو اس مسئلے کا حل بتا پایا اس بار گراں کی ذمے داری سنبھالتا۔ اب گو کہ زہرہ اور شاہد کی وفات کو دو دن گزر گئے تھے۔ مگر وہ زبان سے صامیہ سے یہ نہ کہہ سکیں کہ ”میری بچی اب تم میرے پاس رہو گی۔“

صامیہ جانتی تھی وہ ایسا نہیں کر سکیں گی اور یہی وجہ تھی کہ اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ وہ معاملے کی سنگینی کو پورے طور پر محسوس کر سکتی تھی۔ والدین سے جدائی کا غم ہی کیا کم تھا کہ اپنی بے بسی اور تنہا زندگی کی فکر نے اسے مضطرب کر دیا۔ اب جب کہ دو دن آرام کے بعد ذہن سے اس غم کے طوفان اور آندھیوں کا زور کم ہوا تھا۔ وہ مایوسی کے عالم میں خاموشی کو گلے لگائے بیٹھی تھی۔ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ دنیا کے سارے کام معمول کے مطابق انجام دیے جا رہے تھے۔ کہیں پر ذرا سی کمی نہیں آئی تھی۔ گو کہ فضا سوگوار تھی۔ ماحول غمناک تھا۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ صامیہ وہاں موجود تھی۔

گوہر گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر اس کے پاس بیٹھتی مگر اس کا رویہ بھی بدلا بدلا تھا۔ وہ پرانی ہنس مکھ گوہر جانے کدھر چلی گئی تھی۔ یہ سپاٹ چہرے اور ساکت آنکھوں والی لڑکی گوہر نہیں ہو سکتی۔ دراصل گوہر کی سمجھ میں نہ آتا تھا صامیہ کو کیسے تسلی دے۔ کیا بات کرے۔ ماں باپ کی اندوہناک وفات معمولی بات نہیں ہوتی کہ وہ اس کی توجہ بٹانے کے لیے کسی لطیفے کا سہارا ہی لیتی۔ اس لیے وہ بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ اور خاموش بیٹھی صامیہ کو دیکھتی رہتی۔ آنٹی نور افشاں اسے اکساتیں۔ اشاروں میں کہتیں کہ وہ صامیہ سے باتیں کرے۔ گوہر اچانک ہڑبڑا کر صامیہ کا ہاتھ پکڑ کر کہتی۔

”آؤ صامی! لان میں چلتے ہیں۔ بہت اچھے اچھے پھول کھلے ہیں۔ دل بہل جائے گا۔“

صامیہ کو گوہر کا لہجہ بھی مختلف لگتا۔ تین دن صامیہ کو چپ چاپ سب کی طرف دیکھتے اور ہر ایک کے حکم کی تعمیل میں کھاتے پیتے گزر گئے اور کسی نے اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟

پھوپھا منور علی خان آئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی کے دو الفاظ بدبدا کر باہر چلے گئے۔ پھر کسی نے انیقہ پھپھو سے کہا کہ خان صاحب انہیں گھر لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ انیقہ پھپھو خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

اور جب منور علی خان نے باہر سے ہی انہیں پکارا تو وہ تڑپ کر رہ گئیں۔ چلتے وقت اسے گلے لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ کیسی آزمائش میں مبتلا تھیں انیقہ پھپھو اور تب ہی ان کے دکھ کو محسوس کرکے امیر اکبر اعظم نے انیقہ پھپھو سے کہا۔

”بھابھی! آپ بالکل فکر نہ کریں۔ صامیہ کو میں لے جاؤں گا۔ ابھی اسے بی اے کی تیاری بھی کرنی ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے سکون سے تیاری کا موقع ملے۔ میرے بچوں کے ساتھ اس کا دل بہل جائے گا۔ باقی دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ ایسے انقلاب آتے ہی رہتے ہیں۔“

امیر اکبر اعظم کے پر یقین لہجے سے انیقہ پھپھو کا دل ٹھہر گیا۔ اور وہ اسے پیار کرکے اپنے شوہر منور علی خان کے ہمراہ چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی صامیہ پر ایک اور تنہائی کا خوف طاری ہو گیا۔ وہ تو امیر اکبر اعظم کی مہربانی کہ انہوں نے فوراً ہی اس کو ساتھ لے جانے کا اعلان کر دیا۔ گوہر اس سے لپٹ کر رونے لگی اس نے وعدہ کیا کہ وہ روزانہ اس سے ملنے انکل اکبر کے گھر آیا کرے گی۔ آنٹی نور افشاں نے بھی اسے تاکید کی کہ جب وہ گھبرائے اور جب اس کا جی چاہے وہ ان کے گھر آ جائے۔ دراصل وہ سب چاہتے تھے کہ صامیہ اس مکان سے کہیں چلی جائے تاکہ والدین کی یاد

میں کمی ہو سکے۔ یہاں تو دس بارہ دن اس پر جو قیامت ٹوٹی تھی اس کی المناکی نے سب کو خون کے آنسو رلا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

امیر اکبر اعظم کا وسیع و عریض گھر اس کی پناہ گاہ بن گیا۔ سب اس سے نارمل انداز سے ملے اور انہوں نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا۔ امیر اکبر اعظم منور علی خان کے دور کے رشتے دار تھے۔ لیکن صامیہ نے انہیں بچپن سے اپنے گھر آتے اور اپنے باپ سے ہنسی مذاق کرتے دیکھا تھا۔ وہ شاہد علی کے بہت عزیز دوست تھے اور ان کے گھرانے سے بے تکلفی کے مراسم تھے۔ صامیہ کو ایک کمرہ دے دیا گیا اور بغیر کسی رو رعایت کے اسے بی اے کی تیاری کا حکم دیا گیا۔

چچا امیر اکبر نے صامیہ کی نفسیات سے فائدہ اٹھا کر اسے کسی ہمدردی کا مستحق نہ سمجھا اور اپنی بیٹی لالہ رخ کو بھی ڈانٹ کر کہا کہ وہ دونوں دل لگا کر تیاری کریں اور پوزیشن لائیں، ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ ان کے گھر میں اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی۔ جتنا بڑا گھر تھا اتنے ہی بڑے مکینوں کے دل تھے۔ کئی دن تو اسے احساس ہی نہ ہو سکا کہ وہ اپنے گھر میں نہیں۔ وہ اور لالہ رخ پڑھتی رہتیں۔ دل گھبراتا تو لالہ رخ کھڑکیاں کھول دیتی اور چھوٹے لان میں سرسبز گھاس اور رنگ رنگ کے کھلے پھولوں کو دیکھ کر تبصرہ کرتی رہتیں۔ کبھی کبھی دروازہ کھول کر لان میں آ جاتیں اور کرسیاں ڈال کر سلونی شام کا لطف لیتیں۔ لالہ رخ بہت اچھی ساتھی ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ پڑھنے میں بھی بہت دل لگتا تھا اور باتوں میں بھی اس کا اپنا بڑا پیارا انداز تھا۔ اس کے کمرے کے آگے والے لان میں ہی دوسرا دروازہ کچن کا تھا۔ دراصل صامیہ کو جو کمرہ ملا تھا وہ گیسٹ روم تھا اور لالہ رخ کچن سے فائدہ اٹھانے میں استاد ثابت ہوئی۔ پڑھتے پڑھتے تنگ آ کر وہ ایک دم آستینیں چڑھا لیتی اور دبے پاؤں لان میں جا کر کچن میں گھس جاتی۔ اسے بند دروازوں کی چٹخنی کھولنے میں مہارت تھی۔

دوپہر میں شرفو اور کافیہ آرام کے لیے اپنے کوارٹر میں چلے جاتے۔ تو لالہ رخ کچن میں گھس کر آلو کے چپس یا پکوڑے بناتی۔ کبھی سویاں پکا رہی ہے۔ کبھی کوئی چٹپٹی کھٹی چٹنی یا چائنیز بناتی اور صامیہ کو اپنے ساتھ مصروف رکھتی۔

صامیہ کے آنے کے بعد لالہ رخ کی امی سعدیہ بیگم نے اپنے شوہر کے اس عمل پر اعتراض کیا تھا کہ وہ جوان لڑکوں کے گھر میں کسی غیر لڑکی کو کیوں لے آئے۔ جب کہ اس کے دوسرے عزیز بھی موجود تھے۔ امیر اکبر نے سعدیہ کو یقین دلایا تھا کہ

”یہ لڑکی کسی کے لیے پریشانی کا باعث نہیں بنے گی۔ جب تک امتحان سے فارغ نہیں ہو جاتی کہیں نہیں جائے گی۔ اس وقت سب سے زیادہ پڑھائی کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور وہ اس گھر کے سوا کہیں نہیں ہو سکتی۔ اسے اس کا غم یاد دلانے کی قطعی ضرورت نہیں بلکہ ہر طرح پیار محبت اور رواداری کے سلوک سے صدمے کا اثر کم کرنا ہے۔“ کچھ دن بعد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ امیر اکبر درست کہتے تھے۔ پڑھنے کے علاوہ کوئی اور مشغلہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنے کمرے اور مختصر سے لان کے علاوہ کہیں جاتی ہی نہ تھی۔ کبھی کبھار لالہ رخ کے ساتھ کچن میں چلی جاتی اور بس۔ اس کا کھانا ناشتا کمرے میں ہی پہنچ جاتا اور لالہ رخ اس کا ساتھ دیتی۔ کبھی کبھی وہ شرمندہ ہو کر کہتی۔

”میں بھی سب کے ساتھ کھانا کھا لیا کروں گی لالہ رخ اچھا نہیں لگتا مہمانوں کی طرح۔“

لالہ رخ ہنس کر شرارت سے کہتی۔ ”جناب ہم امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے یہ خوان سج کر آتے ہیں تاکہ ہم ذرا سا بھی وقت ضائع نہ کریں اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہمارے گھر کے جتنے افراد ہیں نا۔ ان کے کھانے ناشتے کے اوقات جدا جدا ہیں۔ شاید ہی سب مل کر کبھی کھاتے ہوں۔ اس لیے آپ بالکل بے فکر رہیں۔“

”اور یہ جو کچن میں گھنٹوں ہم وقت ضائع کرتے

ہیں؟"

"اس کا بیوں کو علم نہیں۔ وہ تو یہی سوچ کر ہماری خاطر کرتے ہیں کہ بچیاں محنت کر رہی ہیں۔"

کچن میں دوپہر کو فرنچ ٹوسٹ بناتے ہوئے لالہ رخ گنگناتا بھول کر باقاعدہ گانے لگی۔ اس کی آواز گھر کے برآمدے میں گئی اور بڑی آپا نے کچن کی باہر سے لگی کنڈی کھول کر اندر جھانکا اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔ بڑی آپا کو دیکھ کر لالہ رخ نے مسکرا کر کہا۔

"آیئے ذرا یہ چکھ کر تو دیکھیے۔ مگر ذرا اندر سے کنڈی لگا لیں۔ کوئی اور آ کر ہمارے معاملے میں مداخلت نہ کر بیٹھے۔"

بڑی آپا کی آنکھوں میں حیرانی دیکھ کر صامیہ شرما گئی۔ اس دن کے بعد اس نے کچن میں جانے سے انکار کر دیا۔ لوگ کیا کہیں گے کہ دکھی غمزدہ لڑکی کھانے پینے میں ذرا تکلف نہیں کرتی۔ بڑی آپا کے علاوہ اور لوگ بھی تو آ سکتے تھے۔ چند دن تو لالہ رخ نے اس کی ضد مان لی اور اکیلی ہی کچن میں مصروف رہ کر کچھ نہ کچھ بناتی اور صامیہ کو کھانے میں شریک کرتی رہی۔ پھر صامیہ کو اس پر بھی شرم آئی اور وہ پھر سے لالہ رخ کا ساتھ دینے لگی۔

لطف تو اس وقت آتا جب صامیہ کی امی شرفو کو ڈانٹتی تھیں اور اسے یاد دلاتی تھیں کہ انڈے کل ہی تو لائے تھے۔ اتنے کم کیسے رہ گئے۔ دودھ تو پورا کا پورا رکھا تھا۔ دیگچی اتنی خالی کیسے ہو گئی۔ کئی بار انہوں نے شرفو سے کہا کہ کچن ٹھیک سے بند کر دیا کرو۔ یقیناً کوئی اندر آ کر چوری کرتا ہے۔ شرفو بے بسی سے سر کھجاتا۔ اس نے کہا نہیں مگر دل میں یقین کر لیا کہ کوئی جن اس کے کچن میں دخل اندازی کر رہا ہے اور اس کی ملازمت کا دشمن ہے ورنہ باہر کھلنے والے دروازے کی چٹخنی اندر سے آپ ہی آپ تو کھل نہیں سکتی۔ حالانکہ وہ روز سختی سے بند کر جاتا تھا اور تقریباً" ہر روز وہ اسے کھلا پاتا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے کافیہ کا جس نے مثالیں دے کر اسے یقین دلایا کہ

"ہو نہ ہو یہ لالہ رخ بی بی کی شرارت ہے۔ وہ اندر کی چٹخنی کھولنے کی ترکیب جانتی ہیں۔" اس کے بعد وہ دروازے میں اندر سے آٹے کا کنستر اور چھوٹی میز پھنسا دیتا جس کا باہر سے سرکانا اتنا آسان نہ تھا اور بے چاری لالہ رخ اب ادھر کی طرف سے جانے کے بجائے اندر برآمدے سے موقع دیکھ کر کچن میں جا گھستی۔

"ہم تو دنیا میں کھانے پینے کے لیے آئے ہیں۔" وہ صامیہ کے منع کرنے پر کہتی۔

"تو تم چوری سے کوئی کام کیوں کرتی ہو۔ آنٹی منع تو نہیں کریں گی۔ اگر تم ان کی اجازت سے چیزیں بناؤ اور کھاؤ۔"

"چوری میں بہت لطف آتا ہے۔" وہ شرارت سے کہتی۔ واقعی اسے چھپ کر کام کرنے میں زیادہ لطف آتا تھا۔ اس کی باتوں، حرکتوں اور بحث کرنے کی عادت سے اتنا ضرور ہوا کہ صامیہ کا ذہن فکر سے آزاد ہو گیا۔ اب اسے اپنی بے بسی پر رونا نہیں آتا تھا بلکہ رات کو سونے سے پہلے ممی کی یاد آتی۔ بابا کا خیال آتا اور وہ تڑپ کر چپکے چپکے آنسو بہا کر رہ جاتی۔ ماں باپ بھی کیسی نعمت اللہ نے دی ہے۔ وہ انکل امیر اکبر اور آنٹی کو دیکھ کر سوچتی۔ وہ ان کی از حد مشکور تھی۔ انفعہ پھپھو نے ایک بار بھی آ کر پھر صورت نہ دکھائی۔ وہ ان کی مجبوریاں سمجھتی تھی اس لیے شکوہ بھی نہیں کر سکی۔ انکل امیر اکبر اس کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ آنٹی بھی اس سے بہت پیار کرنے لگی تھیں۔ وہ اسے بار بار اکساتیں۔

"بھئی ہنسا کرو۔ شرارت کیا کرو لالہ رخ کی طرح۔ تمہاری عمر سنجیدہ رہنے کی نہیں ہے اور کچھ تھوڑی سی سنجیدگی لالہ رخ کو بھی دے دو۔"

✡ ✡ ✡

ایک روز پھوپھا منور علی خان اس سے ملنے آ گئے۔ ان کی نظروں میں تجسس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ مگر اعتراض کا کوئی موقع ملا ہی نہیں۔ البتہ وہ اس سے سوالات کرتے رہے۔ گھر میں کتنے لوگ ہیں؟ کون

"کون آتا ہے؟ تم سے کیسا سلوک ہے گھر والوں کا" وہ جانتی تھی ان کے سوالات بدنفسی پر مبنی ہیں۔ وہ خود بھی امیر اکبر کے رشتے دار تھے۔ کیا انہیں علم نہیں کہ گھر میں کتنے لوگ ہیں۔

امتحان کے بعد لالہ رخ آزاد ہو گئی اور اب وہ صامیہ کی ایک نہ سنتی۔ گھسیٹتی ہوئی باہر لے آتی۔ بڑے لان میں بیڈمنٹن کھیلنے پر مجبور کرتی۔ آنٹی بھی اسے آمادہ کرتی تھیں۔

"کھیلو بھئی بیٹا!" وہ ان کے خلوص سے بھرے لہجے کی شہد آفرینی میں گم ہو جاتی۔ ماں کا یہی لہجہ ہوتا ہے۔ مامتا کا یہی رنگ دلفریب ہوتا ہے۔ آنٹی اس کی بے ضرر شخصیت سے متاثر تھیں۔ اسے پیار دینا چاہتی تھیں۔ مگر رحم یا ترس کے انداز میں نہیں۔ وہ اس سے کم مخاطب ہوتیں۔ لیکن جب بھی کچھ کہتیں اس میں محبت کا رنگ ہوتا۔

اس گھر کے تمام مکینوں سے وہ اب امتحان کے بعد واقف ہوئی۔ لالہ رخ کے علاوہ غزالہ آپی تھیں۔ گل رخ تھی۔ واصف اور عارف تھے۔ گو کہ وہ ان سے ناموں کی حد تک تو پہلے بھی واقف تھی۔ مگر سب کو دیکھا نہ تھا۔ واصف کو تو پہلی بار ہی دیکھا جو بے حد لیے دیے رہنے کا عادی اور بہنوں سے بھی کم مخاطب ہوتا۔ البتہ عارف کی سب سے دوستی تھی۔ وہ صامیہ سے بھی بے تکلف ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

اس دن پورا گھرانہ کہیں پکنک پر جا رہا تھا۔ عارف انتظامات میں مصروف بے حد مستعد تھا۔ واصف بھی عین وقت پر رضامند ہو گیا۔ آنٹی کی زیر ہدایت سب لوگ پارک میں پہنچے۔ پارک میں جھیل کے کنارے بینچوں پر وہ سب قبضہ کر کے بیٹھے تھے۔ لالہ رخ چہک رہی تھی۔ عارف اور گل رخ مسلسل آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ آنٹی ان کے درمیان صلح کروا رہی تھیں۔

لالہ رخ کو بوٹنگ کی سوجھ گئی۔ وہ اور غزالہ کشتی میں جا بیٹھیں۔ صامیہ رضامند نہ ہوئی مگر وہ لالہ رخ کی شرارت سے واقف نہ ہو سکی۔ اپنا چکر پورا کر کے انہوں نے زبردستی صامیہ کو کشتی میں دھکیل دیا۔ کشتی ڈولنے لگی۔ صامیہ چیخی تو واصف بھی کشتی میں آ گیا۔ اور چپو سنبھال لیے۔ لالہ رخ نے تالیاں بجا کر کہا۔

"شاباش بھائی صاحب! صامیہ پانی سے ڈرتی ہے۔ اس کا ڈر نکالیے۔"

صامیہ سچ مچ خوفزدہ ہو گئی۔ کشتی ادھر ادھر لہرا رہی تھی۔ وہ دانت پر دانت جما کر کشتی کا کنارہ پکڑے بیٹھی رہی۔

واصف نے مسکرا کر کہا۔ "سچ مچ ڈرتی ہو۔ ارے یہ تو چھوٹی سی جھیل ہے۔ میں تو سمندر میں کشتی چلاتا ہوں۔ اونچی اونچی لہروں سے لڑتا ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا۔"

"مگر میں تو کبھی کشتی میں نہیں بیٹھی۔ میں گر جاؤں گی۔ یہ۔۔۔ یہ ہل رہی ہے۔" وہ اور بھی خوفزدہ ہو گئی۔

واصف نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ چپو سنبھالے اور کہا۔

"مجھ پر بھروسا کرو۔ اگر تم گر بھی گئیں تو میں سنبھال لوں گا۔ تم اکیلی تو نہیں ہو نا۔"

چکر پورا کر کے جب وہ کنارے پر آئے تو لالہ رخ نے پھر تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔ واصف نے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ مگر صامیہ نے قبول نہیں کیا۔ وہ خود ہی کوشش کر کے باہر آ گئی۔ لالہ رخ حیران تھی کہ اس کا اکھڑ مزاج بھائی جو کبھی کسی لڑکی سے مخاطب تک نہیں ہوتا تھا صامیہ کو نہ صرف کشتی کی سیر کرا لایا بلکہ وہ مسکرا رہا تھا۔ خوش نظر آ رہا تھا۔

عارف نے بھی کہا۔

"بھائی صاحب تو کسی لڑکی کو گھاس نہیں ڈالتے تھے۔ یہ کیسا انقلاب ہے کہ آج وہ جھلائے نہیں بلکہ ہنس رہے ہیں۔"

پکنک کافی پر لطف رہی۔ واصف ان کے ساتھ بہت خوش خلقی سے پیش آ رہا تھا۔ شام کو تھکے ہارے گھر پہنچے تو کافیہ نے رازداری سے کہا۔

"بیگم صاحب! احمر صاحب۔"

لالہ رخ نے صامیہ کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتی ہوئی اندر لے آئی۔ پکنک نے صامیہ کے اعصاب پر خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ تھکن کے باوجود وہ ہلکا پن محسوس کر رہی تھی۔ رات نیند بھی پر سکون رہی۔ لالہ رخ سے باتیں کرتے کرتے وہ سو گئی۔ پھر صبح آنکھ کھلی۔ جب کھڑکی سے سورج کی کرنیں داخل ہو رہی تھیں۔ دن میں گھر کے ماحول میں کچھ تبدیلی سی معلوم ہو رہی تھی۔ عارف شور مچانے کے بجائے دبے قدموں چل رہا تھا۔ غزالہ زیر لب گفتگو کر رہی تھی۔ خود آنٹی بھی سرگوشیاں سی کر رہی تھیں۔ لالہ رخ نے اسے مطلع کیا۔ "چھوٹے چچا بہت الٹی کھوپڑی کے مالک ہیں۔"

سہ پہر کو اس نے بھاری قدموں کی آواز سنی۔ وہ تو رات کے کھانے کے لیے پلاؤ کے چاول چن رہی تھی۔

"اے لڑکی کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے ایک دبی دبی گمبھیر آواز سنی۔ "سنو ایک گلاس ٹھنڈا پانی لاؤ۔ پلیٹ پر رکھ کر۔ ڈھانک کر لانا۔ سنا نہیں تم نے کیا بہری ہو؟"

وہ اچھل پڑی۔ "یقیناً" وہی مخاطب کی جا رہی تھی۔

"جلدی کرو۔ میں دوبارہ کہتا نہیں ہوں۔"

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ "یقیناً" وہ اسی کی جانب متوجہ تھا گو کہ اس کی نگاہیں خانہ کعبہ کی تصویر کی طرف تھیں۔ صامیہ جلدی سے اٹھ گئی۔ وہ گلاس کے ساتھ پانی کی بوتل بھی لے آئی۔ جلدی میں اسے گلاس کے نیچے اوپر کے لیے پلیٹ ہی نہیں ملی۔ اس نے بوتل ہاتھ میں لے کر سنجیدگی سے کہا۔

"گڈ۔ سمجھ دار لگتی ہو۔ بھاگو نہیں' پانی پی لوں تو بوتل گلاس لے کر جانا۔"

پانی پی کر اسے بوتل پکڑاتے ہوئے دانت پر دانت جما کر اس نے دھیرے سے کہا تھا۔

"ہماری بھابی کی حس جمال کافی نکھر گئی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک طرح دار ملازمہ رکھتی ہیں۔"

اور صامیہ پر اچٹتی نظر ڈال کر وہ لمبا چوڑا جنگلی گیلری کی طرف چلا گیا۔ ایک لمحے میں وہ اس کی ذلت کر گیا۔ اچھا انعام دیا تھا۔ صامیہ کا دل بھر آیا۔ لوگ اسے نوکر سمجھتے ہیں؟ اس نے لباس کی طرف نظر ڈالی ٹھیک ٹھاک تھا۔ پھر کیا وہ ملازمہ لگتی ہے؟ اسے رونا آنے لگا۔ وہ کمرے میں گھس کر آئینے میں صورت دیکھنے لگی۔ وہ بھی ٹھیک تھی۔ تب اسے خیال آیا۔ جب تک وہ کمرے تک ہی محدود تھی سب ٹھیک تھا۔ اس نے گھر کے دوسرے حصوں میں دخل اندازی کر کے اپنے لیے مشکلیں پیدا کر لی تھیں۔ اس نے تو یہ سوچ کر باہر قدم نکالے تھے کہ جب رہنا اسی گھر میں ہے نامعلوم مدت تک تو مہمان بنے رہنے سے تو کام چلے گا نہیں۔ وہ گھر والوں کی محبت اور خلوص کا بدلہ چکانا چاہتی تھی۔ بے تکلفی اور اپنائیت کے اظہار سے۔

اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کوئی اسے نوکر کہہ کر پکارے۔ دل کی بات دل میں ہی رکھ کر تصدیق کرتے پھر کہنا بھی ٹھیک لگتا۔ یہ کیا کہ سامنا ہوتے ہی لٹھ سا مار دیا۔ "اور یہ کیا بد ادا تھا وہ؟ طرح دار ملازمہ؟ گویا تحقیر کے ساتھ توصیف تو یہ ہیں وہ چھوٹے چچا جن کی آمد سے گھر کا ماحول ہی اپ سیٹ ہو گیا تھا۔" شام کو لالہ رخ نے پھوپھا منور علی خان کی آمد کی خبر دی اور وہ انہیں اسی کمرے میں لے بھی آئی۔

پھوپھا نے اسے بہت گہری نظروں سے دیکھا۔ سلام کا جواب دے کر معنی خیز لہجے میں بولے۔

"بہت سیر و تفریح کرنے لگی ہو۔" وہ سٹپٹا گئی۔

"کل پارک میں کس کے ساتھ گئی تھیں؟ کون لڑکا تھا وہ کشتی میں تمہارے ساتھ۔ کیوں گئی تھیں؟ بولو۔" انہوں نے سخت اور معترض لہجہ اختیار کیا۔ "میں نے خود دیکھا تھا تمہیں' انکار نہیں کر سکو گی۔" وہ بھلا کب انکار کر رہی تھی۔

"آ۔۔۔ آپ کیا کرنے گئے تھے۔ وہاں کیوں گئے تھے؟" وہ گھبراہٹ میں بے تکے پن سے کہہ بیٹھی۔

منور علی خان کے چہرے پر حیرت کا سایہ رینگنے لگا۔

"اچھا؟ تو تم نے دیکھا تھا مجھے؟ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں بھی اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گیا تھا۔" وہ باہر

سے آئی ہے نا۔ کمپنی کی مہمان ہے سیر کراتا تھا۔ سو..... مگر خبردار تم اپنی پھپھو سے مت کہنا۔"

وہ سخت لہجے میں دھمکی دینے پر اتر آئے۔ ان کے جواب کی دو رخی پالیسی صاف اور روشن تھی۔ صحیح جواب کے ساتھ جھوٹ کی آمیزش ساتھ ہی پھپھو سے پوشیدہ رکھنے کی تاکید۔ انہوں نے لالہ رخ کی لائی ہوئی چائے بھی نہیں پی اس "لوکے" کا اتا پتا معلوم کرنے پر اصرار نہیں کیا۔ البتہ خفگی سے اتنا کہا۔

"اگر آئندہ میں نے تمہیں کہیں باہر دیکھا تو اچھا نہیں ہوگا۔ ہم نے تمہیں غیروں کے پاس اس لیے نہیں چھوڑا کہ تم آزاد ہو جاؤ۔ آیا سمجھ میں۔ اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کا لحاظ رکھنا تمہارا فرض ہے۔ غضب خدا کا۔ ماں باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور صاحبزادی گل چھرے اڑانے لگیں۔ لاحول ولا۔"

صامیہ جواب نہ دے سکی۔ اس کی آواز بند ہو گئی۔ آنکھیں جلنے لگیں۔ سینے میں گرم گرم دھواں سا جمع ہو گیا تھا۔ ان کے جاتے ہی وہ بستر پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ غیروں کے پاس رہنے کے لیے مجبور کی گئی تھی۔ مگر اتنی سی بات وہ بھی نہ کہہ سکی۔ اس کا کیا قصور تھا۔ ماں باپ کے مرنے پر کسی "اپنے" نے اس کے سر پر ہاتھ کیوں نہ رکھا؟ ماں باپ کو اس نے نہیں مارا۔ پھر بھی لوگوں کی نظریں اس کو ہی موردِ الزام ٹھہرا رہی ہیں۔ روتے روتے وہ بے حال ہو گئی۔ لالہ رخ کی ہزار تسلیاں بھی اس کے آنسو نہ روک سکیں۔ سہ پہر کو ایک جنگلی انسان نے اسے نوکرانی بنا دیا تھا۔ وہ دکھ، وہ بے عزتی کا احساس ابھی کم نہ ہوا تھا کہ پھوپھا صاحب زخموں پر نمک چھڑکنے آ گئے۔ اپنے کرتوتوں پر نظر نہیں۔

"کیسے معصوم بن کر کہہ رہے تھے۔ کون لڑکا تھا وہ؟ اپنے رشتے داروں سے بھی ناواقف ہیں۔ بس انہیں بھی ذلت کرنا تھی۔ الزام لگانا تھا۔ اسی لیے تو آئے تھے۔ اب میری زندگی ایسے ناکردہ گناہوں کے داغ دھوتے ہی گزرے گی کیا؟" لالہ رخ ماں کو بلا لائی۔ آنٹی نے اسے سینے سے لگا لیا۔ پیار کیا اور بے حد نرمی اور درد سے اس سے رونے کا سبب پوچھا۔

"ضرور لالہ رخ نے کچھ کہہ دیا ہوگا۔" انہوں نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔ "ابھی میں خبر لیتی ہوں اس کی..... لالہ سنو۔"

اس سے پہلے کہ آنٹی لالہ رخ کو ڈانٹتیں اس نے جلدی سے کہا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔" اور پھر پھوپھا کی ساری بات بتا دی۔ آنٹی کو جلال آ گیا۔ وہ انہیں برا بھلا کہنے لگیں۔ ان کی جرأت پر بگڑ گئیں۔

"غضب خدا کا اپنی خبر نہیں۔ دوسروں پر کیچڑ اچھالنے لگے۔ ایسے ہی غیرت مند تھے تو اپنی بیٹی کو غیروں کے حوالے کیوں کیا۔ میں ان سے بات کروں گی۔ یہ تمہاری نہیں ہماری ذلت کی ہے انہوں نے۔ اور خبردار اگر تم ان سے یا کسی سے بھی ڈریں یا دبیں۔ تم پر کسی نے احسان نہیں کیا ہے جو تمہارا سر جھکے۔ دنیا سے ڈر کر نہیں آنکھ ملا کر بات کرنا اچھا ہوتا ہے۔ جتنا کوئی دبتا ہے لوگ اسے اتنا ہی دباتے ہیں۔ سینہ تان کر مقابلہ کرنے والوں کی جیت ہوتی ہے۔ اب وہ پرانا زمانہ نہیں رہا کہ لڑکیوں کو سر جھکا کر ہر حکم کی تعمیل پر مجبور کیا جاتا تھا۔ تمہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے بیٹی! کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ خود انسان میں قوت مزاحمت ہونا چاہیے۔ اپنے حقوق کی پرکھ سے کام لینا چاہیے۔ چلو اٹھو اور طے کر لو کہ کسی کا تم پر کوئی حق ہے نہ دباؤ۔ بہت مثالیں تم کو ایسی ملیں گی کہ موقع آنے پر اپنوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ اور غیر کام آئے۔ یہ کوئی انہونی نہیں ہے۔ نہ ہی تم پر احسان کر رہے ہیں نہ تم پر کبھی جبر کریں گے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آنٹی! میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

وہ بھرے گلے سے بولی۔ آنٹی کی باتوں سے اسے تسلی بھی ہوئی تھی۔ سہارا ملا تھا اور وہ ان کی ہمدردی پر آبدیدہ ہو گئی تھی۔ آنٹی نے اسے گلے لگا لیا۔

"میں تمہاری ماں تو نہیں ہوں صامیہ! لیکن میں

تمہیں لالہ رخ سے کم نہیں سمجھتی جو نصیحت اسے کروں گی تمہیں بھی کروں گی۔ مجھے تم سے ایسا ہی لگاؤ ہو گیا ہے جیسا اولاد سے ہوتا ہے۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ میں خود منور کو جواب دے لوں گی۔ انہیں ہمارے گھر کے معاملے میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ تم میری بیٹی ہو۔ جہاں چاہوں گی تمہیں لے جاؤں گی۔ اب ہم ہی تمہارے ذمے دار ہیں۔ تم بھی حوصلے سے کام لو۔ رونا دھونا بزدلی کی نشانی ہے۔ بے بسی کا اظہار ہے ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ اس لیے اب تم کسی کو جواب دہ نہیں ہو۔ سمجھ گئیں نا؟"

صامیہ کو آنٹی کے قریب سے اٹھتی مہک نے سرشار کر دیا تھا۔ وہ جذباتی ہو گئی۔ لالہ رخ نے بتا دیا کہ وہ رات کو اکثر روتی ہے۔ آنٹی خفا ہونے لگیں۔ سمجھانے لگیں کہ وہ بچی نہیں ہے جو راتوں کو نیند خراب کرے۔ حالات کا مقابلہ کرنا ہی کامیابی کی دلیل ہے۔

"بس آنٹی.....! وہ تو امی اور بابا یاد آتے ہیں تو آنسو آ جاتے ہیں۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔

رات کو ان کے کمرے میں عارف اور غزالہ آپی نے قوالی کا اہتمام کیا۔ گل رخ کسی سے دف مانگ لائی۔ خالی ڈبے کو لالہ رخ نے پیٹنا شروع کر دیا۔ بے ہنگم شور سے کمرہ گونجنے لگا۔ تب واصف نے اندر آ کر کہا۔

"چھوٹے چچا خفا ہو رہے ہیں۔ تم لوگ کیوں شور کر رہے ہو؟" سب ایک دم چپ ہو گئے۔

غزالہ آپی اور گل رخ فوراً ہی چلی گئیں۔ عارف بڑبڑاتا رہا۔ لالہ رخ نے بستر پر لیٹنے کے بعد چپکے سے بتایا۔ "چھوٹے چچا بہت ظالم ہیں۔ ان کے پیدا ہوتے ہی دادی اماں بے چاری کا انتقال ہو گیا تھا۔ کبھی پھپھو انہیں اپنے گھر لے جاتیں۔ کبھی ابا جان کوئی بوا رکھ کر ان کی پرورش کرتے۔ جب ابا جان نے شادی کر لی تو چھوٹے چچا کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ اپنی محرومی کا ذمہ دار امی اور ہم لوگوں کو سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ابا جان ہمیشہ ان کو گود میں کھلاتے رہیں گے۔ بھائی صاحب کے ساتھ ساتھ وہ خود کو بھی ان ہی کا ہم عمر سمجھتے تھے۔ ان کے سب کھلونوں پر قبضہ کر لیتے تھے..... ان سے چھین کر دودھ پیتے تھے۔ یعنی ہمیشہ وہ بھائی صاحب کی برابری کرتے اور انہیں دبا کے مار پیٹ کر سب کچھ چھین لیتے تھے۔"

"اور آنٹی کچھ نہیں کہتی تھیں؟"

"لو! ابا جان کا حکم تھا کہ انہیں کچھ نہ کہا جائے۔ ابا جان چھوٹے چچا کو بہت چاہتے ہیں اور چھوٹے چچا جان ابا جان پر فدا ہیں۔ امی اور ہم لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔"

"عجیب آدمی ہیں۔" صامیہ کو چھوٹے چچا کی عادتیں پسند نہیں آئیں۔

☆ ☆ ☆

لالہ رخ نے گھر کی صفائی کا پروگرام بنایا تھا۔ ابھی وہ کمر پر دوپٹہ باندھ کر اس پر عمل درآمد نہ کر پائی تھی کہ جانے کدھر سے چھوٹے چچا برآمد ہوئے۔

"اے لڑکی.....!" انہوں نے صامیہ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "کیا نام ہے تمہارا چلو تم ادھر کیا کر رہی ہو۔ میرے کمرے میں شاید مہینوں سے جھاڑ پونچھ نہیں ہوئی ہے۔ میں تو دفع ہو گیا تھا پھر کسی کو کیا پروا ہوتی۔ اب تم جا کر صفائی کرو چھوڑو یہاں کا کام ہوتا رہے گا۔ پہلے میرا کام ہونا چاہیے۔"

وہ ایسے رعب سے بول رہے تھے کہ لالہ رخ اور صامیہ کو جواب دینے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ کمر سے دوپٹہ کھول کر صامیہ چپ چاپ ان کے پیچھے چل پڑی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمرہ گرد آلود تھا اور اس کی جھاڑ پونچھ میں کچھ زیادہ وقت بھی نہ لگا۔ لالہ رخ بھی اس کی مدد کے لیے آ گئی۔

جب ہر طرف کی صفائی ہو گئی تو انہوں نے دونوں لڑکیوں کا شکریہ ادا کیا۔ کم از کم اتنی انسانیت تو تھی۔ لالہ رخ مگر بڑبڑاتی رہی کہ انہیں کیا حق تھا کہ وہ صامیہ کو حکم دیں۔

گوہر نور افشاں کے ساتھ آئی۔ وہ صامیہ کو مطمئن اور پرسکون دیکھ کر متعجب ہوئی۔ آنٹی نور افشاں صامیہ

کر گلے لگا کر آبدیدہ ہوگئیں۔ وہ صامیہ سے محبت کرتی تھیں۔ دراصل پچھلے دو برس سے تو ایک ہی گھر میں رہائش تھی ان سب کی آنٹی نور افشاں صامیہ کی امی کی سہیلی تھیں۔ گوہر کے ابو کا انتقال ہوا تو اس کی امی نے ہمدردی کے اظہار میں آنٹی نور افشاں کو اپنے گھر بلا لیا۔ اس طرح وہ فوری طور پر مکان کے کرائے بجلی کے بل وغیرہ کی پریشانی سے بچ گئیں۔ پھر انہیں اسکول میں سروس مل گئی اور انہوں نے اپنا کچن علیحدہ کر لیا گو کہ شاہد اور زہرہ نے اختلاف کیا تھا مگر نور افشاں ان کی انسان دوست فطرت کا ناجائز فائدہ اٹھانے پر رضامند نہ ہوئیں۔ گوہر صامیہ کی ہم عمر تھی۔ دوستی تو ہونی ہی تھی۔ گوہر دلچسپ لڑکی تھی۔ اس نے آج بھی بڑا دلچسپ سوال کر ڈالا۔

"سنو صامی! اگر یہ لوگ تمہیں مستقل اپنے گھر میں رکھیں گے بہو بنا کر۔"

"بیکار بات مت کرو گوہر.....!"

"بیکار کی کیا بات ہے۔ ایسا ناممکن بھی نہیں۔ سنا ہے سب تمہیں پسند کرتے ہیں۔ آخر تمہاری شادی تو ہوگی ہی تمہیں نہ نہیں۔"

"شادی سے مجھے دلچسپی نہیں ہے گوہر! نہ ہی ان لوگوں کو۔"

"حالانکہ انکل کے دو عدد بیٹے بھی ہیں۔ آخر انہوں نے ہی خاص طور پر تمہیں....."

"اس ذکر کو جانے دو۔" وہ چڑ گئی۔

"تمہاری پھپھو نے امی کو بتایا ہے کہ وہ تمہیں اس لیے ساتھ نہیں لے گئیں کہ..... اس میں تمہارا مفاد نہ تھا۔ ان کے شوہر کیریکٹر کے اچھے نہیں ہیں اور پھر ان کا بیٹا بھی جوان ہے۔ اگر دونوں باپ بیٹے مقابل آگئے تو بہت بڑا طوفان کھڑا ہو جائے گا۔"

گوہر کے انکشاف نے صامیہ کو پریشان کر دیا۔ اس کی ذات خطرے کی علامت بن گئی تھی۔ وہ کتنی بے خبر تھی۔ لوگ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں اسے آج علم ہوا۔ بعد میں لالہ رخ نے اسے بتایا آنٹی نور افشاں، امی سے کہہ گئی ہیں صامیہ کو انیقہ آنٹی کے گھر بھی نہ بھیجیں۔ ان لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔

صامیہ سر تھام کر رہ گئی۔ کیا ہو رہا ہے یہ۔ اس کی ذات سب سے الگ ہو کر بھی توجہ کا مرکز کیوں بنی ہوئی ہے؟ اس کے پاس ہے کیا؟ اور جب اسے ان کی محبت کی ضرورت تھی تو انہوں نے بخل سے کام لیا۔

"آنٹی ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ مجھے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ خود کو بہادری کے لیے آمادہ کر رہی تھی۔ تنہا آدمی بھی کس قدر غیر محفوظ ہوتا ہے۔ اسے خود ہی اپنی حفاظت کرنی ہوگی۔ حوصلے اور خود اعتمادی سے انکل امیر اعظم اس کی خود اعتمادی بحال کرنا چاہتے تھے۔ دکھوں کی دنیا بہت وسیع ہے۔ جدھر دیکھو، غور کرو تو ہر چہرہ دکھوں سے داغدار ہوگا۔ کوئی کم کوئی زیادہ تو پھر ان کا مقابلہ کرنا ہی بہتر ہے نہ کہ واویلا کر کے دوسروں کو زچ کرنا۔

☼ ☼ ☼

جب وہ اپنے دکھوں کے خول سے باہر نکلی تو اسے ہر جگہ قسم قسم کی محرومیاں نظر آئیں۔

شرفو اور کافیہ کے دکھ بھی عجیب تھے۔ کافیہ کو اولاد کی کمی تھی۔ شرفو کے پاس رحم نہ تھا۔ وہ کافیہ کو ذرا سی بات پر دھنک دیتا۔ پھر بے چاری کافیہ واویلا کرتی۔ آنٹی شرفو کو ڈانٹ کر شرمندہ کرتیں۔ کافیہ کی ساس بھی کم نہ تھی۔ مگر مجبوری یہ تھی کہ کافیہ امیر اکبر کی گھریلو ملازمہ تھی اور اسی کو انہوں نے کوارٹر دیا تھا۔ اب ساس اسے اس گھر سے نکال نہیں سکتی تھی۔ ہاتھ مل کر رہ جاتی۔ بیٹے کو کوسا کرتی جو شہر میں نوکری کے شوق میں گاؤں سے آگیا۔ گاؤں میں وہ اپنی مرضی سے بہو کو چار چوٹ کی مار دیتی تھی یہاں تو ایک دفعہ ہی مارا تھا۔ مارا بھی کیا تھا بس ہاتھ چھوایا ہی تھا کہ وہ منحوس فیل مچاتی کوٹھی میں دوڑ گئی۔ پھر بیگم صاحبہ نے آکر اس کی خبر لی تھی اور کہا تھا کہ یہ کوارٹر کافیہ کا ہے۔ اگر تمہیں رہنا ہے تو پیار و محبت سے رہو۔ ورنہ گاؤں چلی جاؤ۔ میری ملازمہ پر ہاتھ اٹھانے کا تمہیں حق نہیں ہے۔ اس دن سے بے چاری ساس کی سٹی گم تھی۔

بس زبانی تیر چلا کر رہ جاتی۔ صامیہ کو کافیہ سے ہمدردی تھی۔ وہ بے ماں باپ کی تھی اور بہت بے بس و تنہا تھی۔

شرفو موڈی آدمی تھا۔ کبھی کبھی اس سے ہمدردی بھی کر لیتا تھا۔ زیادہ تر تو لڑتا ہی تھا۔ کچن میں بھی کئی دفعہ وہ اس کی چمچے کفگیر سے دھنائی کر چکا تھا۔ کافیہ بیگم صاحبہ سے یہ بات چھپا جاتی۔ اگر بیگم صاحبہ کو غصہ آ گیا اور انہوں نے شرفو کو نکل جانے کو کہا تو اس کا ٹھکانہ بھی چھن جائے گا۔ پھر وہی گاؤں ہوگا اور ساس کی جوتیاں یہاں تو غزالہ' لالہ رخ کی اترن اس کا تن ڈھانپنے کو کافی تھی۔ وہاں اسے پھٹا پرانا بھی نصیب نہ تھا۔ بھوکا رہنا پڑتا اور جانور کی طرح گھر کا سارا کام بھی۔ وہ یہاں خوش تھی۔ کم از کم اس کی عزت تھی۔ رعب تھا کہ بیگم صاحبہ نے اسے ہی تو رکھا تھا۔ شرفو تو بعد میں رکھا گیا تھا۔ وہ بھی کافیہ کی سفارش پر۔

کافیہ سب سے بے **تکلف** تھی۔ بس اسے احمر صاحب سے ڈر لگتا تھا جو غصہ آنے پر لال لال آنکھوں سے سب کو گھورا کرتے تھے۔ بیگم صاحبہ سے تو ان کی بنتی ہی نہ تھی۔ ہر بات پر اعتراض کرتے تھے۔ اف اس دن کھانا گرم ہونے میں دیر ہوگئی تو بلی کے بچے پر غصہ اتارا۔ کیا بے رحمی سے کس کر اسے لات ماری بے چارا بچہ اذیت سے ناچتا ہوا کونے میں گھس گیا۔ کبھی بہت غصہ آتا تو برتن توڑنا شروع کر دیتے۔ نیا ٹی سیٹ غارت کر دیا۔ بیگم صاحبہ بھی ایسے دم سادھ کر بیٹھ جاتیں۔ کبھی جو ڈانٹیں۔ ایسا دیور بھی رعایت کے لائق ہوتا ہے بھلا؟ مگر کافیہ ایسی باتیں دل میں ہی روک لیتی، کہتی کس سے۔

"باپ رے باپ۔ جس کا خیال آجائے وہ خود بھی حاضر ہو جاتا ہے۔ جبھی بزرگ کہتے ہیں اچھی اچھی باتیں سوچنا چاہیے۔ احمر صاحب آگئے۔"

"سنو لڑکی! وہ تمہاری بہن کدھر گئی۔ اس سے کہو ایک پیالی چائے بنائے اور مجھے دے جائے۔ ہاں سنو۔ تم نہ لانا۔ تمہاری بنائی ہوئی چائے میں نہیں پیوں گا۔ پیالی تمہارے سر پر توڑ دوں گا سمجھیں۔ اسے بلاؤ وہ اچھی چائے بناتی ہے۔"

وہ کہہ کر حکم دے کر واپس مڑ گئے۔ اب کافیہ اپنی اس نادیدہ بہن کو کہاں سے لائے۔ سر تھام کر رہ گئی۔ وہ تو صامیہ بی بی کی مہربانی تھی کہ اس کی پریشانی کی وجہ پوچھ بیٹھیں اور خود ہی چائے بنا کر لے گئیں ورنہ اس کی شامت آنے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔

"لڑکی! میں نے تمہیں موزے اور رومال دھونے کے لیے دیے تھے کتنے دن میں سوکھ جائیں گے؟" احمر صاحب کے لہجے میں بڑی تلخی ہوتی تھی۔ سیدھے سادھے انداز میں بات کرنا ان کی توہین تھی۔

صامیہ گڑبڑا گئی۔ اف اسے تو یاد ہی نہ رہا۔ اس نے وہ موزے رومال میلے کپڑوں میں ڈال دیے تھے اور اس دن سے کپڑے تو دھلے بھی نہیں۔ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زبان دانتوں میں دبا کر تیزی سے اٹھی۔

"ابھی دھوتی ہوں جی۔ کپڑے، کپڑے تو دھلے نہیں وہ تو....."

"میں کپڑوں کی نہیں اپنے موزوں اور رومال کی بات کر رہا ہوں۔"

احمر کا لہجہ خود بخود نرم ہو گیا۔ اس کو صامیہ کا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دانتوں تلے زبان دبانا بڑا دلچسپ لگا۔

"ابھی..... ابھی بس..... دھو دیتی ہوں۔" وہ احمر کی پراسرار نظروں سے اس قدر خائف کیوں ہو جاتی تھی۔ اس نے کبھی اپنے کپڑے تو دھوئے نہیں تھے۔ وہ بدبودار موزے اور چیکٹ رومال کیسے دھوئے گی مگر وہ اٹھ گئی تھی۔ چل پڑی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ بے دلی سے کام کرنا مجھے پسند نہیں۔ جاؤ بھابھی جان سے کہہ دو مجھے نئے موزے رومال منگوا دیں۔" بڑا تیز لہجہ تھا حکم دینے کا۔

یہ آسان کام تھا اسی لیے اس نے مستعدی سے کہا۔ "ابھی کہتی ہوں۔"

"اسی لیے میں گھر سے باہر رہتا ہوں۔ کسی کو میرا خیال نہیں۔ میرے کام، میری چیزیں سب کے لیے بھولنے کے لیے ہوتی ہیں۔ پھر سب کہتے ہیں میں غصہ کرتا ہوں۔ گھر میں نہیں ٹکتا۔ کس لیے گھر میں

رہوں۔ خون جلانے سے بہتر ہے آدمی آوارگی کرتا رہے۔"

وہ کب تک بڑبڑاتا رہا۔ صامیہ تو بھاگ آئی تھی۔ احمر کوئی نہ کوئی جھگڑا کھڑا رکھتا۔ ذرا سی بات پہ بھتے سے اکھڑ جاتا۔

"یہ... یہ کھانا انسان کے لیے ہے یا چڑیا کے لیے۔ اتنا کم کھانا؟ میں فقیر یا سوالی نہیں ہوں۔ گھر پہ حق ہے میرا لے جاؤ یہ احسان کے پہاڑ۔ توڑ دو میرے سر پر۔"

لیکن وہ پیالے اپنے سر پر توڑنے کے بجائے زمین پر پٹخ کر توڑ دیتا۔ ادھر ادھر سالن بہہ جاتا۔ بوٹیاں لڑھکتی رہتیں۔ دوسرے وقت بھی وہ کھانا نہ کھاتا۔ پھر امیر اکبر اعظم اسے منا کر لاتے اور وہ یوں اکڑ کر بیٹھتا۔ ایسے کھانا کھاتا جیسے سب پر احسان کر رہا ہو۔ روٹھا روٹھا احمر اعظم چھوٹا سا بچہ لگتا۔ اس کے قد و قامت پر یہ ناز نخرے ذرا نہ جچتے۔ وہ صامیہ سے خوب کام لیتا۔ وہ اس کی مرضی کے مطابق ہر کام کرتی تھی۔ کم از کم وہ تو یہی کہتا تھا مگر لالہ رخ ہنس جاتی۔

"ہر کسی کو اپنا تابع فرمان بنانا چاہتے ہیں۔ حکومت کرنا ہی تو ان کا ارمان ہے۔ ہم پر اب ان کا بس نہیں چلتا نا!"

اسے تو یہ بھی یقین نہ تھا کہ وہ صامیہ کی حقیقت سے واقف نہیں۔

"سمجھتے ہیں بہت چالاک ہیں۔ ہر کام ختم کر بھی دیتی ہو۔ میں تو ٹل جاتی ہوں۔ غزالہ آپی تو ان کا سامنا کرنے سے لرزتی ہیں۔ ایک دفعہ تھپڑ رسید کر دیا تھا۔ بے چاری آپی کا منہ سوج گیا تھا۔"

"مارتے بھی ہیں؟" صامیہ خوفزدہ ہو گئی۔

"اور کیا۔" بڑی بے تکلفی سے۔ "کسی دن تمہاری شامت آ گئی تو دیکھنا۔"

☼ ☼ ☼

جانے کس قبولیت کی گھڑی میں لالہ رخ کے منہ سے یہ بات نکلی تھی۔ امیر اکبر اعظم اور سعدیہ بیگم کسی شادی میں گئے ہوئے تھے۔ واصف کو کسی دوست کے لیے تحفہ لینا تھا۔ لالہ رخ بھی اپنی ایک دوست کو اس کی شادی پر کوئی خاص قسم کی چیز دینا چاہتی تھی۔ اس نے صامیہ کو بھی گھسیٹ لیا اور زبردستی اپنے ساتھ لے گئی۔ مارکیٹ میں بڑا رش تھا۔

اسے بہت کوفت ہوئی۔ جب خود کچھ لینا بھی نہ ہو۔ محض دیکھتے رہنا ہو تو دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

وہ بھی لالہ رخ کے ساتھ آ کر پچھتائی۔ واصف نے ان دونوں کے لیے ایک ایک سوٹ خریدا۔ بہت قیمتی تو نہ تھا۔ مگر فیشن کے مطابق تھا۔ لالہ رخ بہت خوش ہوئی۔ صامیہ کو تکلف سا تھا۔

"نہیں، یہ تو زیادتی ہے۔ مجھے تو ضرورت بھی نہ تھی۔ میں اس لیے تو ساتھ نہیں آئی تھی۔"

"ہمیں علم ہے تم کس لیے آئی تھیں۔ بس رہنے دو۔" لالہ رخ نے اسے ڈانٹا۔ واصف سنجیدہ ہو گیا۔

"تحفہ تو محبت اور خلوص کی نشانی ہوتا ہے۔" لالہ رخ نے اس کو سمجھایا۔ وہ سوٹ پیس واپس کرنے پر مصر تھی۔

"خلوص کی توہین نہ کرو صامیہ!"

گھر روانہ ہوتے وقت اسے یاد آیا۔ صبح ہی احمر نے اسے حکم دیا تھا کہ اس کے کمرے کی صفائی کر دی جائے اور گرم کپڑے الماری سے نکال کر دھوپ دکھا دی جائے۔ سردیاں شروع ہو گئی تھیں۔ جونہی اسے یہ بات یاد آئی۔ وہ مضطرب ہو گئی۔ سورج تو جانے والا تھا۔ کب کپڑے دھوپ میں رکھے جائیں گے بھلا۔ اس نے لالہ رخ کو بتا دیا۔ پھر بھی اس نے واپسی میں جلدی نہ کی۔ اطمینان سے ہر دکان دیکھتی ہوئی آئی۔ گھر میں احمر اعظم بیچ گیلری میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ تینوں کو ساتھ اندر آتے دیکھ کر ان کی بھنویں تن گئیں۔

"میرا کام ہو گیا؟" انہوں نے بلا تکلف سوال کر ڈالا۔

صامیہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ بلا عذر ان کے کمرے کی طرف لپکی۔ لالہ رخ اور واصف حیرانی سے اسے دیکھتے رہے۔ طنزیہ ایک نظر دونوں پر پھینکتے ہوئے امیر

احمر اعظم بھی اپنے کمرے کی طرف چلے۔ واصف نے ہاتھ میں لیا ہوا تحفے کا ڈبہ وہیں زمین پر پٹخ دیا اور تنتناتا ہوا وہ بھی اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ اکیلی لالہ رخ دروازے پر کھڑی رہ گئی۔ اس کے ہاتھ پیر سنسنانے لگے۔

"آئی شامت غریب کی۔"

انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ پھر بھی صامیہ شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ ایک کام بتایا وہ بھی نہ کر سکی۔ اس نے برش اٹھا کر فرش کی صفائی شروع کی ہی تھی کہ احمر اعظم آ گئے اور اس کے ہاتھ سے برش چھین کر باہر پھینک دیا۔ وہ الماری کے گرم کپڑے اٹھا کر باہر لے آئی۔ دھوپ میں ڈالنا چاہے۔ تو وہ بھی انہوں نے اس سے لے کر وہیں زمین پر پٹخ دیے۔ وہ اٹھانے کو جھکی تو وہ آڑے آ گئے۔

بے بسی سے ہونٹ کاٹتی وہ پھر ان کے کمرے میں جا گھسی۔ غلطی اسی کی تھی۔ سزا بھی اسے ہی ملنا چاہیے تھی۔ وہ چیزیں ادھر ادھر کر کے ڈسٹنگ کر رہی تھی۔ احمر اعظم کو چین کہاں تھا۔ وہ بھی اندر آ گئے اور ساری کتابیں گلدان وغیرہ پھر سے بے ترتیب کر کے رکھ دیے۔ بستر کی چادر کھینچ کر کرسی پر ڈال دی اور ضدی بچے کی طرح خاموشی سے تخریبی کارروائیاں کرتے رہے۔ صامیہ کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔

"بھئی، یہ ڈانٹتے کیوں نہیں۔ کچھ بولیں تو وہ بھی جواب دے۔ خوامخواہ ہر کام خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

اس نے باتھ روم سے میلا تولیہ اور ان کے اتارے ہوئے کپڑے سمیٹ کر ٹب میں ڈال دیے اور صاف تولیہ لا کر ٹانگ دیا۔ اس دوران وہ میلے کپڑے لے جا کر پلنگ پر باقاعدہ بچھا چکے تھے۔ اس کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ پلنگ سے میلے کپڑے گھسیٹ کر اس نے زمین پر ڈالے اور انہیں گھور کر دیکھا۔ کمر پر ہاتھ باندھ کر لڑاکا عورتوں کی طرح جھنجلا کر پوچھا۔

"کیا ہے؟ گندے کپڑے بستر پر ڈال دیے۔"

"اس گھر میں جس طرح کی بے قاعدگی کا دستور ہے۔ وہی کر رہا ہوں۔"

"گھر میں بے قاعدگی نہیں ہے۔ آپ کے مغز میں کوئی کیڑا ہے۔ خوامخواہ ہر کام خراب کرنے پر تل گئے ہیں۔ جائیے آپ باہر جائیے۔ مجھے کام کرنے دیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا کام خود بھی کر سکتا ہوں۔ محتاج نہیں ہوں۔ چلو دفع ہو۔"

صامیہ سلگ کر رہ گئی۔ اس نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"تم جاتی ہو کہ لگاؤں ایک ہاتھ۔ دور جا کر گرو گی۔" وہ چلا کر بولے۔

"میں سب کام ختم کر کے جاؤں گی۔" اسے ضد آ گئی۔

"واہ۔ یہ بات بڑی مضحکہ خیز ہے۔ کام میرا ہے میں خود کر لوں گا۔" وہ زہریلے لہجے میں بولے۔ "تم جاؤ اور خبردار میری کسی چیز کو چھوا تو جان نکال لوں گا۔"

وہ تو نیچے پڑے گلدان کو اٹھانے کو جھکی تھی۔ جلدی سے سیدھی ہو گئی اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

"اچھا۔ اتنی ہمت ہے تو نکالیے پہلے میری جان پھر میں کام بھی کر لوں۔ ورنہ سب کے سامنے طعنے دیں گے کہ ایک کام بتایا تھا وہ بھی میں نے نہیں کیا۔"

حیرت کا ایک ہلکا سا تاثر احمر کے چہرے پر ابھرا۔ پھر وہ تلخی سے بڑبڑائے۔

"ہونہہ! اس گھر کے مکینوں کی بیزاری نوکروں پر بھی عیاں ہے۔ ابھی یہ ذرا سی پدی بھی بک بک کر کے کان کھا رہی ہے۔ کاش میرے پاس ذرا سا اختیار ہوتا۔"

"ارے تو کیا غضب ہو گیا۔" اسے بھی جلال آ گیا۔

"ذرا سی دیر ہی تو ہوئی ہے۔ کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ پانچ منٹ میں سب کچھ کر لوں گی۔ باہر تو نکلیے آپ۔"

وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ "کیا؟ تم مجھے باہر نکلنے کا کہہ رہی ہو؟" وہ غضبناک ہو کر بولے۔ "دو ٹکے کی

پھوکری مجھے حکم دیتی ہے۔ دفع ہو جا یہاں سے۔ میں رعایت کر رہا ہوں ورنہ یہاں تیری لاش پڑی ہوتی۔" کہہ کر تپائی کو لات مارتے ہوئے امیر احمر اعظم دھم دھم کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

صامیہ سن کھڑی رہ گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنی ذلت پر روئے یا اس جنگلی کی بد زبانی پر ہنسے یا پھر اس مکالمے کو مذاق سمجھ کر ہضم کر لے۔ جو بھی تھا۔ اس کے دل کو دکھ ہوا چوٹ پہنچی تھی۔ وہ ملازمہ تو نہیں تھی۔ نگران کے گھر جو آ کر پڑ گئی تھی۔ اسی لیے تو سب کچھ سننا اور سہنا پڑ رہا تھا۔ جب وہ دھاروں دھار روتی ہوئی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ اور دھم سے بستر پر اوندھی لیٹ کر سسکنے لگی۔ واصف وہیں موجود تھا اور لالہ رخ بھی دونوں نے اسے روتے دیکھا تھا۔ اس سے چند منٹ پہلے واصف' لالہ رخ پر ناراض ہوا تھا کہ "صامیہ آتے ہی چھوٹے چچا کے پاس کیوں چلی گئی۔ ان کا کام کیوں کر رہی ہے۔ تم منع کیوں نہیں کرتیں۔" صامیہ کو بے قراری سے روتا دیکھ کر دونوں پریشان ہو گئے۔

لالہ رخ نے فوراً ہی کہا۔ "مل گیا انعام اور کرو ان کی خدمت۔ تمہیں بتایا ہے کہ وہ اس لائق نہیں۔ ہوا کیا تھا؟"

اور اس نے احساس پر پڑی اس ضرب اور اس کی اذیت کا حال کہہ دیا۔ وہ بے قرار ہو کر رو رہی تھی۔ اور اسے خود پر قابو ہی نہ رہا تھا کہ سب کچھ اگل دیا۔ کچھ رکھا ہی نہیں باقی۔ بعد میں خود ہی پشیمان بھی ہوئی تھی۔ جب واصف اور لالہ رخ ساتھ ساتھ اٹھ کر چلے گئے۔ واصف لال چہرے کے ساتھ اور لالہ رخ بڑبڑاتی ہوئی گئی تھی۔ تب اسے خیال آیا یہ اس نے غلط کام کر دیا تھا۔ چچا کی شکایت بھتیجے بھتیجی سے کیوں؟ اسے شکوہ تھا تو خود ہی احمر سے کہتی یا پھر انکل اکبر اعظم سے۔ وہ پچھتاتی رہی۔ بعد میں واصف نے چچا کی طرف سے معذرت بھی کی تھی۔ مگر اس وقت تک اس کا غصہ پچھتاوے میں بدل چکا تھا۔ اس لیے اسے واصف کی مداخلت بھی اچھی نہ لگی۔ اس کی وجہ سے گھر میں چپقلش ہو۔ یہ وہ نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

موسم بدل رہا تھا۔ ماحول میں خزاں کا تسلط دل و جان پر سستی بن کر چھا رہا تھا۔ جھکڑ چلنے لگے تھے اور سوکھے پتے ہر سمت ناچتے پھرتے۔ فضا میں اداسی چھائی رہتی۔ حالانکہ غزالہ کی شادی کا ___ ہنگامہ بھی جاری تھا اور سر شام ہی عزیزوں کی لڑکیاں' لالہ رخ اور غزالہ کی سہیلیاں جمع ہو کر گانے بجانے میں مصروف ہو جاتیں۔ ہر سمت تیز بلبوں کی روشنی اجالے بکھیرتی مگر صامیہ کے دل پر جو بوجھ تھا۔ وہ کسی طور نہ ہٹ سکا۔ حالانکہ اس قصے کو کئی ماہ گزر چکے تھے اور اس نے یونیورسٹی میں داخلہ بھی لے لیا تھا۔ جبکہ انیقہ پھپھو' منور علی خان اور آنٹی نور افشاں کی طرف سے مخالفت بھی ہوئی۔ انیقہ پھپھو تو محض اپنے شوہر کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے مخالفت کر رہی تھیں۔ اور پھوپھا منور علی خان اسے اپنے بیٹے اطہر علی سے منسوب کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ پر آمادہ تھے۔ آنٹی نور افشاں محض ہمدردی میں بولی تھیں۔ وہ اس موقع پر اس کو اپنے گھر کا ہوتا دیکھنا چاہتی تھیں تاکہ اس کے ذہن پر سے صدمے کا تاثر بالکل ختم ہو جائے اور وہ جو اب تک کھوئی کھوئی سی رہتی تھی۔ الگ تھلگ سب سے کٹ کر رہنے لگی تھی۔ یہ بھی نہ رہے۔ دراصل گوہر کی شادی کی تیاری کرتے ہوئے انہیں صامیہ بہت یاد آئی۔ اس کے والدین کے احسانات' ان کی محبتیں اور جب وہ دنیا میں اکیلی دکھ اٹھا رہی تھی۔ تب زہرہ ان کے لیے سائبان بن گئی تھی۔ اب اس کی اپنی بیٹی دنیا میں اکیلی رہ گئی ہے تو وہ اس کے لیے بے چین تھیں۔ ایک اچھا رشتہ بھی تھا۔

مگر صامیہ اپنے ارادے میں اٹل تھی۔ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی اور اپنے پیروں پر باعزت طریقے پر کھڑا ہونا چاہتی تھی۔ کسی مرد کے سہارے سے نہیں۔ آنٹی اور انکل اس معاملے میں اس کے ہمنوا تھے۔ اس لیے اسے کوئی تردد نہ کرنا پڑا تھا۔ آنٹی نور افشاں

نے اس کے جذبات کی اس حد تک ہمنوائی کی کہ امیر اکبر اعظم سے کہہ دیا کہ وہ منور علی خان کے بیٹے سے ہرگز ہرگز اس کی شادی نہ کریں۔ بلکہ ابھی سے صاف جواب دے دیں اور انہوں نے یہی کیا بھی لیکن اس سے پہلے سعدیہ کے ذریعے صامیہ کی مرضی بھی دریافت کر لی جو کہ سو فیصد یہی تھی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی کی دنیا کالج سے بالکل مختلف تھی۔ لیکن صامیہ صبر و ضبط اور خود اعتمادی کے بل پر ہر مشکل سے گزرتی گئی۔ اس کے لیے یونیورسٹی کے آزاد ماحول سے سمجھوتا کرنا بھی آسان نہ تھا۔ لیکن وہ اس کو بھی جھیل گئی۔ نہ کسی سے بلا ضرورت خطاب کیا۔ نہ بے تکلفی سے پیش آئی۔ لیکن موسم خزاں کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی مرجھا رہا تھا۔ کوئی حس اسے گنہگار ٹھہرا رہی تھی۔ جب وہ انکل امیر اکبر اعظم کو دیکھتی جو غزالہ کی شادی کے سلسلے میں اکیلے ہی ادھر سے ادھر سرگرداں رہتے اور کبھی تھکن سے بے حال ہو کر بے اختیار کہہ بیٹھتے۔

"پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے ہوتا تو کچھ تو ہاتھ بٹاتا۔ کم از کم میں اتنا اکیلا تو نہ ہوتا۔" کبھی سعدیہ بیگم سے شکوہ کرتے۔ "تمہارے بیٹے کس قدر ناکارہ ہیں۔ ایک کام بتایا تھا وہ بھی ان سے نہ ہوا۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ صاحبزادوں کو اپنے دوستوں کی زیادہ فکر ہے۔ میری ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا کرنا ان کا فرض نہیں ہے۔ ایک کے دس دوست ہیں۔ دوسرے کے بیس ہیں۔ ان کے بقول باقی دوست ابھی تک کارڈ نہ ملنے پر ناراض ہیں۔ اب میں ان کو منانے کا فرض ادا کروں۔ کارڈ موجود نہیں ہیں تو اور چھپواؤں۔"

"آپ حسن ابدال کے میر جلال کو تو خط لکھ کر احمر کے بارے میں معلوم کریں۔" آنٹی نے مشورہ دیا۔

"لکھ چکا ہوں بابا! کارڈ بھی بھیجا ہے اسے۔ اگر وہ شکار پر نہ گیا ہوگا تو ضرور آئے گا۔"

احمر کے بارے میں اکبر اعظم کی فکر و تردد کو دیکھ دیکھ کر صامیہ کو اپنے جرم کی سنگینی کا اور بھی احساس ہو رہا تھا۔ احمر اعظم اس دن کے بعد جو گئے تو ان کی کوئی خیر خبر نہ ملی۔ پتا نہیں واصف نے ان سے کیا کہا تھا اور لالہ رخ نے کس طرح صامیہ کی وکالت کی تھی کہ وہ اپنا کمرہ جوں کا توں چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ جس طرح گرم کپڑے زمین پر ڈھیر تھے۔ اسی طرح پڑے رہے۔ کمرے کے اندر کرسی پر پلنگ کی چادر اس طرح پڑی تھی میلے کپڑے بھی فرش پر جوں کے توں رکھے رہے۔ جیسے کہ صامیہ کی موجودگی میں تھے۔ کمرہ جس طرح بے ترتیب تھا۔ اسی طرح بند کر دیا گیا۔ صرف باہر پڑے گرم کپڑوں کو ان کے پلنگ پر ڈال دیا گیا تھا اور صامیہ کے احساس کو کمرے کی خراب حالت ہی اذیت پہنچا رہی تھی۔ مگر لالہ رخ غصے میں تھی۔ اس نے چچا کو برا بھلا کہتے ہوئے کمرہ لاک کیا اور چابی ماں کے پاس پہنچا دی۔ اس بات کو کئی مہینے گزر چکے تھے مگر صامیہ کو اس دن کی بات خوب یاد تھی۔ اپنی حماقت سمیت۔ جب اس نے رو رو کر واصف اور لالہ رخ کو ان کے چچا کے خلاف ورغلایا تھا۔ اسے اپنی یہ حرکت آج بھی اتنی ہی غلط اور نامناسب لگ رہی تھی۔ جتنی اس روز واقعہ کے چند منٹ بعد لگی تھی۔ لیکن امیر احمر اعظم تو شاید کسی موقع کے منتظر تھے کہ واصف کے شرمندہ کرنے کے بعد فوراً ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ البتہ چند دن بعد ان کا ایک خط صامیہ کو ملا تھا۔ جس میں انہوں نے اس سے معذرت کی تھی۔

"میں معافی کا عادی نہیں اس لیے معذرت پر اکتفا کر رہا ہوں۔" انہوں نے لکھا تھا۔ "دراصل گھر والوں کی یہ غلطی بھی میرے جرم میں اضافے کا سبب بنی ہے۔ کبھی کسی نے تم سے تعارف نہیں کرایا۔ اسی لیے میں تم سے واقف ہی نہیں ہوا۔ بہرحال' میں تم سے شرمندہ ہوں۔ وہ چند الفاظ جو تمہاری شان میں میری گھٹیا زبان سے ادا ہوئے۔ اس کی معذرت۔"

اور تب سے صامیہ کا دل اداس رہنے لگا تھا۔ آنٹی سے اس نے دبی زبان سے اپنی غلطی کا اظہار بھی کیا مگر وہ ٹال گئیں۔ بولیں۔ "چھوڑو صامیہ! وہ لڑکا تو ہے ہی